بچوں کی

سبز کتاب

گھر بھر کے لیے

سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، جنوبی پنجاب
کا
ہرا بھرا پروجیکٹ

بچوں کی
سبز کتاب

PCTB-060622-835

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اس کتاب کے تمام تر حقوق مصنف کے نام محفوظ ہیں۔اس کتاب کو کسی بھی شکل میں مصنف کی اجازت کے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

نام کتاب: بچوں کی سبز کتاب

مصنف: ڈاکٹر احتشام انور

ڈیزائننگ: محمد نوید احمد قادری

معاونین: ضیاء اللہ، آصف ریاض

پروف ریڈنگ: نعیم احمد ناز

ایڈیشن: دوم (نومبر ۲۰۲۲)

اظہار تشکر

ہم اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور اور میاں نواز شریف زرعی یونیورسٹی ملتان کے ممنون ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے حتمی مسودہ کا جائزہ لے کر ہمیں اپنی قیمتی آرا سے آگاہ کیا۔

ہم پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ کے ایم ڈی ڈاکٹر فاروق منظور کے بھی تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ جنھوں نے نئی نسل کو موسمیاتی تبدیلی کے مضمرات سے آگاہ کرنے کی ضرورت کا ادراک کرتے ہوئے، بورڈ سے اس کتاب کی بروقت منظوری کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

فہرست

باب 1 :	موسمیاتی تبدیلی (۱)	08
باب 2 :	موسمیاتی تبدیلی (۲)	13
باب 3 :	موسمیاتی تبدیلی (۳)	17
باب 4 :	پانی کہانی	23
باب 5 :	سیلاب کی تباہ کاریاں	28
باب 6 :	لان کی تیاری (۱)	33
باب 7 :	لان کی تیاری (۲)	37
باب 8 :	لان کی تیاری (۳)	41
باب 9 :	کچن گارڈننگ	48
باب 10:	درون خانہ پودے	57
باب 11:	میاواکی جنگل	62
باب 12:	سرسبز سکول	68
باب 13:	پارک کی دیکھ بھال	75
باب 14:	جانوروں کے ساتھ حسن سلوک	80
باب 15:	گاؤں کی سیر (۱)	88
باب 16:	گاؤں کی سیر (۲)	95
باب 17:	ذمہ دار شہری	100
	اشاریہ	104

انتساب

اُس جگنو کے نام!
کہ اپنے بچپن کی رُتوں میں
باغوں میں، باغیچوں میں
جسے ہم چمکتا دیکھتے تھے
بڑھ کے مٹھی میں چھپا لیتے تھے
پھر انگلیوں کے دریچوں میں
دمکتا دیکھتے تھے
وہ بچپن نہ جانے کہاں کھو گیا
ہمارے رہن سہن نے بھی
کچھ ایسی جوُن بدلی
پھولوں، پتوں، پودوں، پیڑوں سے
کچھ ایسی بے اعتنائی برتی
کہ وہ جگنو بھی کہیں پنہاں ہوگیا
اب اُس بچپن کو، اُس جگنو کو
ڈھونڈنے نکلے ہیں تو
افسوس صد افسوس!
وہ بچپن تو کسی مول نہیں ملتا
کسی طور نہیں ملتا
ہاں اگر پیڑ پودا اُگ جائے تو
شاید روٹھا ہوا، جگنو لوٹ آئے وہ
یہ باب، یہ کتاب، یہ انتساب
اُسی جگنو کے نام!

پیش لفظ

کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ کہ جو کوئی بڑا خواب دیکھتے ہیں اور پھر اس کی تعبیر بھی پا لیتے ہیں۔ہمارا بھی اک خواب تھا اور آج تعبیر کی شکل میں آپ کے ہاتھ میں ہے، الحمدللہ۔

ہم نے خواب دیکھا تھا کہ ہمارے ملک کا ہر اک فرد اس دنیا کا شہری ہونے کے ناتے، اپنے پودوں، پھولوں، موسموں، پہاڑوں، فصلوں، پرندوں، جانوروں، تتلیوں، جگنوؤں سے محبت کرے، ان کو لاحق خطرات کے بارے میں مکمل ادراک رکھے، اس حوالہ سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے، اور پھر انہیں بھرپور انداز میں ادا کرے۔اور اس سب کا نقطہ آغاز ہونا تھا کہ ہم اپنی درسگاہوں میں اس حوالہ سے تعلیم وتربیت کا اہتمام کر سکیں۔

صرف یہی نہیں، واقفان حال دہائی دے رہے ہیں، متنبہ کر رہے ہیں کہ دنیا بھر میں موسمیاتی تبدیلی سے اپنی یہ پاک سرزمین پانچواں متاثر ترین ملک ہے۔اور اگر ہمیں اس قدر بڑے چیلنج کا سامنا کرنا ہے، اس سے نمٹنا ہے تو پوری قوم کو، پورے ملک کو متحرک کرنا پڑے گا۔دوسرے اداروں کے ساتھ ساتھ، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر، ہماری درسگاہوں کو اس کے حوالہ سے شعور اور آگہی پھیلانا ہوگی۔پس ہم نے طے کر لیا کہ اپنے سکولوں میں موسمیاتی تبدیلی کو بطور ایک مضمون متعارف کروائیں گے۔اپنے آس پاس پوچھا تو یار لوگوں نے بتایا کہ دنیا بھر میں کوئی ایسا ملک نہیں کہ جس کے سکولوں میں موسمیاتی تبدیلی کو بطور ایک انفرادی مضمون پڑھایا جا رہا ہو، ہاں اس کے موضوعات مختلف مضامین کے تحت ضرور پڑھائے جاتے ہیں۔

یہاں ہمارا موقف یہ ہے کہ ضروری تو نہیں، ہم ہمیشہ مغرب کی تقلید کریں۔ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم کسی اچھے کام، کسی اچھی روایت کا آغاز کریں اور مغرب اسے اپنا لے، اس کی پیروی کرے۔

رہی بات اس کے موضوعات کو دوسرے مضامین کے تحت پڑھانے کی تو ہمارا ماننا یہ ہے کہ جب تک ان تمام موضوعات کو یکجا کر کے بطور ایک مضمون نہ پڑھایا جائے گا، بچوں کو مربوط اور مکمل معلومات مل سکیں گی نہ انہیں ان کی اہمیت اور نزاکت کا ادراک ہو سکے گا، اور نہ ہی مطلوبہ نتائج اور فوائد کشید کیے جا سکیں گے۔ویسے بھی ہمارے ملک کو موسمیاتی تبدیلی سے جس درجہ کا خطرہ لاحق ہے، اب کوئی غیر معمولی اقدامات ہی ہمارے بچاؤ کا سامان کر سکتے ہیں۔سو ایک نئے مضمون کا ڈول ڈال رہے ہیں ہم، اپنے جنوبی پنجاب میں۔

یہاں قرعہ فال ساتویں جماعت کے نام اس لیے نکلا کیونکہ اس عمر میں بچے نہ تو اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ موسمیاتی تبدیلی جیسے اہم موضوعات کی اہمیت اور افادیت کو نہ سمجھ سکیں اور نہ ہی اس قدر بڑے کہ ان کی عادات اور رویے پختہ ہو چکے ہوں۔ہمیں یقین ہے ہم آج اپنی اس کاوش کے نتیجہ میں ان میں ایسے رویے تشکیل دے پائیں گے کہ جو آنے والے کل، انہیں ایک ذمہ دار شہری بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔دیے سے دیا جلتا رہا تو چند ہی سال میں ایک ایسی قوم کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو شعور اور آگہی کی اس نہج پہ ہوگی کہ جہاں موسمیاتی تبدیلی اور اس جیسے دوسرے خطرات سے نمٹنا سہل ہو سکے گا۔

اب سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ پڑھایا کیا جائے؟

موضوعات منتشر تھے اور کوئی ایک جامع کتاب دستیاب نہ تھی۔سو اپنی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک کتاب تیار کرنے کی ٹھانی۔طے یہ پایا کہ روایت سے ہٹ کر یہ کتاب کہانی اور مکالمے کے انداز میں تحریر کی جائے جو ایک لڑکے اور لڑکی کے کردار کے گرد گھومے تا کہ ہمارے سب بچے اور بچیاں ان سے نسبت محسوس کر سکیں اور اس کو وہ اپنی ہی کہانی جانیں۔باقی کردار اور واقعات بھی ہم نے اپنے آس پاس سے ہی ڈھونڈ نکالے۔

اب اس کتاب میں بڑے سے بڑے سائنسی اور جغرافیائی تصورات کو انتہائی عام فہم زبان میں مکالمے اور گفتگو کی شکل میں بیان کر دیا ہے کہ بچے بوجھ نہ جانیں اور کہانی ہی کہانی میں، کھیل ہی کھیل میں وہ سیکھ جائیں جو ہم انہیں سکھلانا چاہتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی کہ یہ کتاب محض موسمیاتی تبدیلی کے موضوعات ہی نہیں سکھلاتی، جا بجا اخلاقی اسباق اس طرح پیوست کر دیے گئے ہیں کہ غیر محسوس انداز میں بچہ بہت سی اچھی باتیں، اچھی عادات واطوار بھی سیکھتا چلا جائے۔

بچوں کی دلچسپی کا سامان کرنے کے لیے رنگ برنگی، دل لبھاتی تصویریں بنوائیں، جہاں ضرورت پڑی اصل بھی استعمال کیں، معیاری کاغذ اور چھپائی کا اہتمام کیا، اور آج یہ کتاب چھپ کر آپ کے ہاتھ میں ہے۔

ارے! ہم آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئے، یہ سب کام کوئی چند دنوں، ہفتوں، مہینوں میں نہیں ہوا۔اس ساری کاوش کو کتاب کی شکل میں ڈھالنے میں ہمارے دو سال بیت گئے۔

ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے، بہتری کی گنجائش مگر پھر بھی ہوگی۔آپ کی آراء اور تجاویز کی روشنی میں، اور سکولوں میں اسے پڑھانے سے حاصل ہونے والے تجربے سے، آنے والے ایڈیشن میں بہتری کا سفر جاری رکھیں گے۔

کہنے کو تو ہم کتاب بچوں کی تیار کرنے چلے تھے لیکن جو دم بھر کے دیکھا تو جانا کہ وہ تمام موضوعات بھی اس میں سمو دیے گئے ہیں کہ جن میں بڑوں کو بھی دلچسپی ہو سکتی ہے اور وہ اپنے بھلے، اپنے فائدے کے لیے ان سے سیکھ سکتے ہیں، رہنمائی لے سکتے ہیں۔یقین نہ آئے تو صفحے پلٹ کر دیکھ لیں۔

اہتشام

اگست ۲۰۲۲

موسمیاتی تبدیلی (۱)

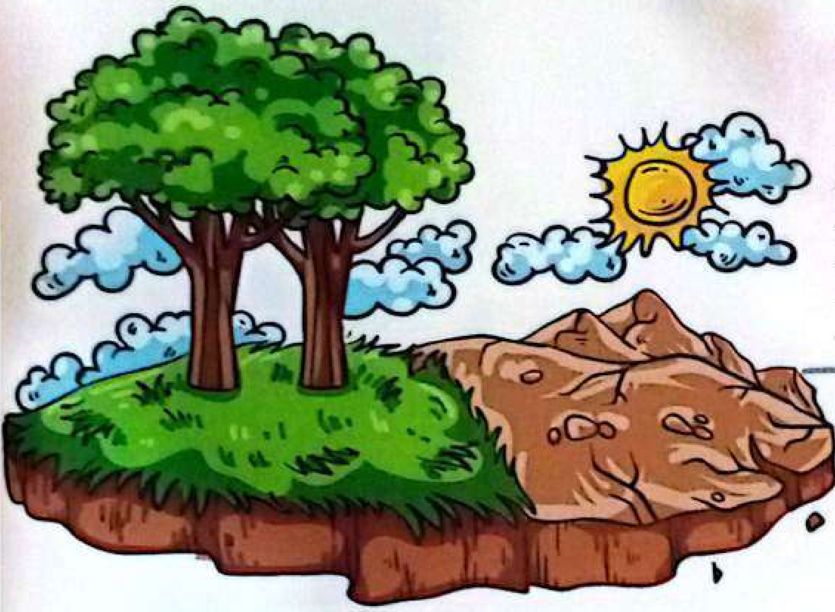

''یہ موسمیاتی تبدیلی کیا ہوتی ہے؟'' خضر نے سکول سے واپسی پر اپنا بستہ ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ شاید آج جغرافیہ کے پیریڈ میں ان کے ٹیچر نے اس کے بارے میں کوئی بات کی تھی۔

''بھئی یہ کون سی مشکل بات ہے، موسم میں تبدیلی کو موسمیاتی تبدیلی کہتے ہیں۔'' عمر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عمر صاحب ایک وفاقی محکمہ 'سروے آف پاکستان' میں ملازم تھے اور نوکری کے حوالہ سے اکثر مُلک کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی ان دوروں پر ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے تھے تا کہ وہ لوگ اپنے مُلک اور اس میں بسنے والوں کے بارے میں اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ ان کی بیوی، ڈاکٹر شہناز عمر، ایک ماہرِ غذائیت تھیں۔ خضر بڑا بیٹا تھا اور مقامی سکول میں ہفتم جماعت کا طالبِ علم تھا۔ گُل اُس کی چھوٹی بہن تھی اور اِسی سکول میں ششم کی طالبہ تھی۔ دونوں میاں بیوی نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ ان کے بچے ماحول اور اسے درپیش خطرات کا پورا پورا ادراک رکھتے ہوں اور اس حوالہ سے شجر کاری، باغبانی اور اس نوعیت کے دیگر اقدامات کے ذریعہ اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔

''تو کیا موسم میں تبدیلی کوئی بُری بات ہوتی ہے؟'' خضر نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

''ہوتی ہے، اگر موسمیاتی تبدیلی قدرتی عوامل کی وجہ سے نہ ہو اور اس کے کسی خطّے اور اس میں رہنے والوں پر مُضر اثرات مُرتب ہوتے ہوں۔'' عمر صاحب نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''قدرتی عوامل سے کیا مراد ہے؟'' خضر نے اگلا سوال کیا۔

''سردیوں گرمیوں کے موسم بھی تو آپس میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اس طرح کی تبدیلی قدرتی عمل ہے۔ لیکن ہم جس موسمیاتی تبدیلی کی بات کرتے ہیں وہ انسانی سرگرمیوں کے نتیجہ میں آتی ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ دنیا کا درجہ حرارت دھیرے دھیرے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسے گلوبل وارمنگ بھی کہتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ دنیا بتدریج گرم ہوتی چلی جا رہی ہے۔'' عمر صاحب نے وضاحت کی۔

''کیسے آتی ہے یہ موسمیاتی تبدیلی؟'' سوال پوچھنے کی اب گُل کی باری تھی جو باپ بیٹے کی گفتگو بغور سُن رہی تھی۔

''یہ ایک طویل موضوع ہے اور اہم بھی، تم لوگ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالو تو اس کے بارے میں بات کرتے ہیں۔'' عمر صاحب نے بچوں کو ہدایت دی۔

بچے کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تو عمر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا، ''موسمیاتی تبدیلی کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن ایک بڑی وجہ جنگلات کی کٹائی ہے۔''

''جنگلات کٹنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' گُل سمجھنا چاہ رہی تھی۔

''ایک فرق پڑتا ہو تو بتاؤں، سب سے پہلے تو یہ کہ جنگل زمین کے لیے پھیپھڑوں کا کام دیتے ہیں، کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن کو خارج۔ اس کے علاوہ بھی ہوا سے مُضر گیسیں اور ذرّات جذب کر کے اسے صاف بناتے ہیں۔ پھر جنگلات بہت سے پرندوں اور جانوروں کا مَسکن بھی ہوتے ہیں۔ وہ خوراک حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں اور طبی فوائد کے حامل پودوں کا بھی۔ ان سے حاصل ہونے والی لکڑی جلانے، فرنیچر بنانے اور تعمیراتی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ درختوں سے ہی کاغذ بنایا جاتا ہے۔ سیلاب کے خلاف ڈھال کا کام

دیتے ہیں اور زمین کا کٹاؤ روکتے ہیں۔ درخت آندھیوں اور تیز بارشوں کا زور بھی توڑ دیتے ہیں اور اس طرح بہت حد تک ان سے ہونے والے نقصان، خاص طور پر مٹی کو اکھڑنے سے بچا لیتے ہیں۔ اور پھر یہ موسموں کی شدت کو بھی کم کرتے ہیں۔'' عمر صاحب ایک ہی سانس میں بے شمار فوائد گنوا گئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جنگلات کے بیان کردہ فوائد سے مُستفید ہونے کے لیے کسی ملک کے کم از کم 25 فیصد رقبہ پر جنگلات ہونا ضروری ہیں اور اس کے برعکس پاکستان کے محض 4.8 فیصد رقبہ پر جنگلات موجود ہیں۔

''اگر درختوں کے اتنے فائدے ہیں تو لوگ انھیں کیوں کاٹتے ہیں؟'' گُل نے پوچھا۔

''خاصا معقول سوال ہے'' عمر صاحب نے ہمیشہ کی طرح سوال پوچھنے پر اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، ''یہ سب تیزی سے بڑھتی

آبادی کا کیا دھرا ہے، نئے گھر بنانے اور نئے شہر بسانے کے لیے لوگ جنگلات کاٹ دیتے ہیں۔ اور پھر زیادہ خوراک بھی درکار ہوتی ہے اس لیے بھی جنگل صاف کر کے فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔ اس کی لکڑی کو بھی لوگ استعمال میں لاتے ہیں بلکہ کمائی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ویسے بھی بہت سے خودغرض لوگ اپنے وقتی فائدے کے لیے دور کا نہیں سوچتے، خاص طور پر آنے والی نسلوں کا۔ درختوں کی غیر قانونی کٹائی تو ایک طرف، لوگ باقاعدہ ان کی چوری کرتے ہیں۔ اس پر بھی ظلم یہ کہ اپنی چوری چھپانے کے لیے بعض اوقات جنگلات کو آگ بھی لگا دیتے ہیں۔"

"یہ تو بہت بُری بات ہے" خضر نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا، "مجھے تو سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ درختوں کے کٹنے سے پرندے اور جانور اپنے مساکن سے محروم ہو جاتے ہوں گے۔"

"تو اور کیا، جانوروں اور پرندوں کی بہت سی اقسام تو اِسی وجہ سے اب معدوم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔" عمر صاحب نے اتفاق کیا۔

"وہ ایک بھلا سا شعر بھی ہے ناں پروین شاکر کا، اس حوالہ سے۔" ڈاکٹر شہناز نے نشان دہی کی۔

"ہاں جی بچو! پروین شاکر اُردو کی ایک نامور شاعرہ تھیں" عمر صاحب بچوں کو بتانے لگے، "انھوں نے کیا خوب کہا ہے:

؎ اس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اس بوڑھے شجر سے "

''ہم درختوں کی کٹائی کس طرح روک سکتے ہیں؟'' گُل کی آواز میں تشویش نمایاں تھی۔

''درخت اکثر کھانا پکانے اور حرارت حاصل کرنے کے لیے کاٹے جاتے ہیں۔ایسی جگہوں پر ہمیں ان مقاصد کے لیے سستی گیس مہیا کی جانی چاہیے'' عمر صاحب گُل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے،''ویسے بھی ماحولیات کے حوالہ سے ہمیں لوگوں میں شعور پیدا کرنا ہوگا،متعلقہ قوانین کا سختی سے اطلاق کرنا ہوگا۔''

''لوگوں میں شعور کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟'' گُل نے اگلا سوال کیا۔

''ویسے تو شعور پیدا کرنے کے لیے سوشل میڈیا سمیت تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے لیکن میری رائے میں اس کا بہترین ذریعہ ہمارے تعلیمی ادارے ہو سکتے ہیں۔بد قسمتی سے ہمارے تعلیمی اداروں میں ماحولیات جیسے اہم موضوع کو نہ تو خاطر خواہ اہمیت دی جاتی ہے نہ ہی اس حوالہ سے شعور اُجاگر کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش کی جاتی ہے۔میری رائے میں تو موسمیاتی تبدیلی کی اہمیت کے پیش نظر اس کو ہفتم کی سطح پر ایک الگ مضمون کے طور پر نصاب میں متعارف کروانا چاہیے۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

''ہفتم جماعت ہی کیوں؟'' خضر چونکہ خود ہفتم جماعت کا طالب علم تھا اس کا سوال پوچھنا فطری تھا۔

''ہفتم جماعت اس لیے کہ عام طور پر اس عمر کے لگ بھگ بچہ نہ تو اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ماحولیات اور اس سے جُڑے معاملات اور ان کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے اور نہ ہی اتنا بڑا کہ اس کی عادات پختہ ہو چکی ہوں اور بدلی نہ جا سکیں۔اگر ہم اس عُمر میں اپنی نسل کی تربیت کرنا شروع کریں گے تو ہی چند سالوں میں یہ بچے باشعور اور ذمہ دار شہری بن جائیں گے۔'' عمر صاحب نے وضاحت کی۔

بچوں کے دماغ میں ابھی بہت سے اور سوال بھی کُلبلا رہے تھے لیکن عمر صاحب کہنے لگے کہ موسمیاتی تبدیلی ایک بحث طلب اور طویل موضوع ہے جس پر باقی بات اب اگلے روز ہوگی۔

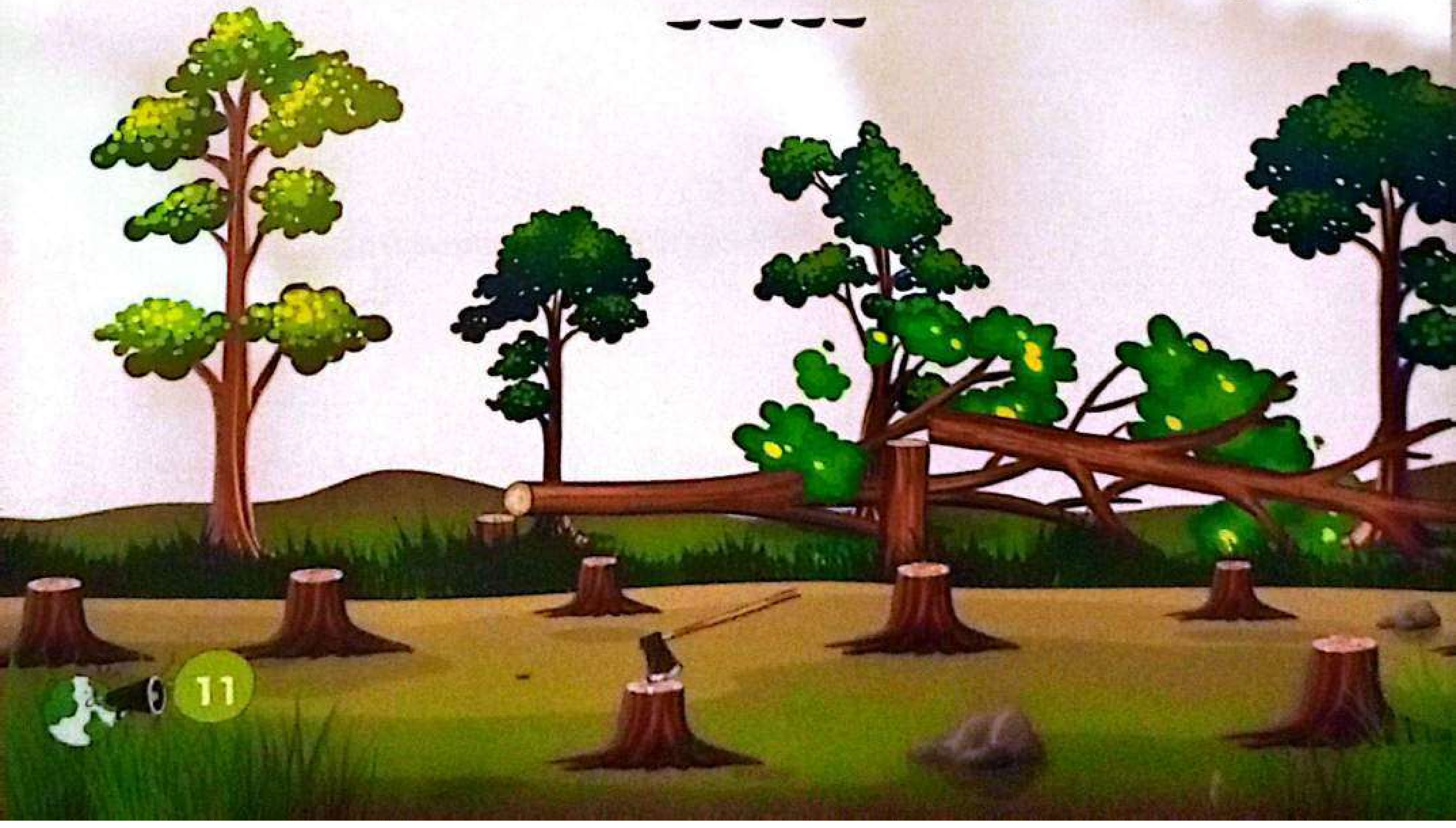

مشق

سوال:

1. موسمیاتی تبدیلی کیا ہے؟ اس کی اہم وجوہات سے آگاہ کیجیے۔
2. گلوبل وارمنگ کسے کہتے ہیں؟
3. جنگلات کے فوائد کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی کٹائی کے نقصانات سے آگاہ کیجیے۔
4. جنگلات زمین کے کٹاؤ کو کس طرح روکتے ہیں؟ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سوچیے اور ضبطِ تحریر میں لائیے۔
5. ماحولیات کے حوالہ سے لوگوں میں شعور کن طریقوں سے بیدار کیا جا سکتا ہے؟

عملی کام

سکول کا کام

ایک خاکہ (مختصر ڈرامہ) تیار کروائیے جس میں ایک بچے کو جنگل کے درخت کا کردار دیجیے، ایک بچہ انسان کا کردار ادا کرے اور ایک تیسرے بچے کو جج بنائیے۔ جنگل کا درخت انسان کے حوالہ سے اپنی شکایات، جب کہ انسان اپنی صفائی پیش کرے گا۔ سماعت مکمل ہونے پر جج اپنا فیصلہ سنائے گا اور مستقبل کے حوالہ سے احکامات دے گا۔ جہاں تک ممکن ہو جماعت کے زیادہ سے زیادہ بچوں کو یہ کردار نبھانے کا موقع دیں۔ جماعت کی سطح پر اس سرگرمی کے کامیاب انعقاد کے بعد انچارج سکول کی مشاورت سے سکول کے مرکزی ہال یا کسی موزوں میدان میں دیگر جماعتوں کے بچوں کے سامنے بھی اس ڈرامے کو پیش کریں۔

بچے مضمون پڑھنے کے بعد موسمیاتی تبدیلی کی وجوہات، نتائج اور تدارک کے اقدامات پر اپنے گھر والوں کے ساتھ مکالمہ کریں۔ اگر گھر والوں کی اس حوالہ سے معلومات محدود ہوں تو ان کی معلومات میں اضافہ کریں۔ مزید یہ کہ تمام بچے اپنے والدین یا دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر جنگلات کے فوائد اور ان کے کٹنے کی وجوہات اور نقصانات پر مبنی چارٹ یا پوسٹر بنا کر لائیں۔ ٹیچر سکول کے دیگر بچوں کے لیے ان کی نمائش کا اہتمام کریں اور بہترین کارکردگی پر اوّل، دوم اور سوم انعامات دیں۔

موسمیاتی تبدیلی (۲)

اگلے روز شام کو بچے اپنا ہوم ورک کر کے فارغ ہوئے تو پھر ٹی وی لاؤنج میں عمر صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے، گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں کل ختم ہوا تھا۔

''موسمیاتی تبدیلی کی ایک بڑی وجہ آلودگی بھی ہے'' عمر صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا، ''آپ کو پتا ہے آلودگی کیا ہوتی ہے؟''

خضر نے جھٹ سے ہاتھ کھڑا کیا اور بولا ''آلودگی سے مُراد ہوا، پانی اور مٹی میں مُضر مواد کا شامل ہونا ہے جیسے دُھواں، زہریلی گیسیں، کیمیکل ذرّات وغیرہ۔''

''شاباش، درست کہا آپ نے، اور یہ آلودگی آتی کہاں سے ہے؟'' عمر صاحب نے اگلا سوال داغا۔

''ہوا میں تو آلودگی گاڑیوں، اینٹوں کے بھٹّوں اور فیکٹریوں کے دُھویں اور مُضر گیسوں کے اخراج سے شامل ہوتی ہے۔ پانی میں آلودگی سیوریج کے پانی اور فیکٹریوں کے فُضلے سے آتی ہے۔ اس کے علاوہ کوڑا کرکٹ، شاپنگ بیگ، کیمیائی کھادیں، اور کیڑے مار ادویات وغیرہ بھی پانی اور زمینی آلودگی کا باعث بنتے ہیں۔ زیرِ تعمیر عمارتوں اور سڑکوں سے اُڑنے والی گرد سے بھی ہر طرح کی آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے۔'' خضر نے معاشرتی علوم کی کتاب میں پڑھا ہوا سبق دُہرا دیا۔

''لیکن ابو! آلودگی سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟'' گُل جو کافی دیر سے باپ بیٹے کی گفتگو خاموشی سے سُن رہی تھی، پوچھنے لگی۔

''سب سے پہلے تو آلودگی سے صحت کے مسائل مثلاً سانس، پیٹ، جِلد وغیرہ کے امراض جنم لیتے ہیں۔ پرندوں اور دیگر جانوروں، حشرات الارض، اور آبی حیات سب کے لیے آلودگی نقصان دہ ہے۔ اور پھر اس سے ہمیں سموگ جیسے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔'' عمر صاحب بولے۔

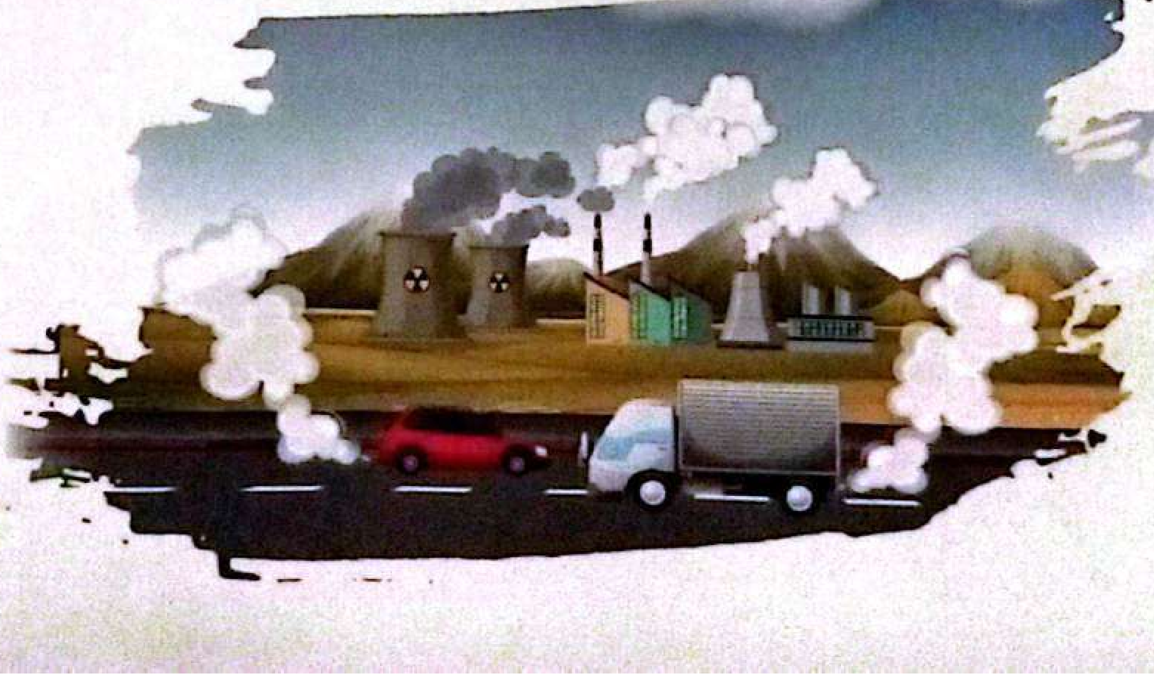

''سموگ کیا ہوتی ہے؟'' دونوں بچوں نے بیک وقت سوال کیا۔

''پاکستان کے کچھ شہروں میں موسمِ سرما کے آغاز کے ساتھ ہی فضا میں دُھند، دُھویں اور گرد کی وجہ سے جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس کو سموگ کہتے ہیں۔ یہ صحت کے لیے خاصی مُضر ہوتی ہے اور حدِ نگاہ کو بھی بہت حد تک گھٹا دیتی ہے۔ بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کو تو ان دنوں میں خاص طور پر احتیاط کرنا پڑتی ہے۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

''ہم آلودگی اور سموگ سے کیسے بچ سکتے ہیں؟'' بچے کچھ تشویش میں مبتلا ہونے لگے۔

''اس کے لیے ہمیں بہت سے اقدامات لینا ہوں گے۔ ایک تو جہاں تک ممکن ہو ہمیں سائیکل کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اگر ہو سکے تو ان کے لیے سڑکوں میں علیحدہ لین مختص کی جانی چاہیے۔ اسی طرح پبلک ٹرانسپورٹ یعنی بسوں، ویگنوں کے معاملات کو بہتر بنا کر ان کے استعمال کو ترجیح دینی چاہیے۔ اپنی ذاتی گاڑیوں کو بھی اچھی حالت میں رکھنا چاہیے تاکہ دُھویں کا اخراج کم سے کم ہو۔ فیکٹریوں، کارخانوں اور اینٹوں کے بھٹوں کو بھی پابند کرنا چاہیے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے دُھویں کے اخراج کو کم سے کم سطح پر رکھیں۔ ہمارے کسانوں کو بھی فصلوں کی باقیات کو آگ لگا کر تلف نہیں کرنا چاہیے۔

سیوریج اور فیکٹریوں سے خارج ہونے والے آلودہ پانی کو بھی ٹیکنالوجی کی مدد سے صاف کر کے قریبی نالے میں ڈالا جا سکتا ہے یا دوبارہ استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔'' عمر صاحب نے تفصیل سے جواب دیا۔

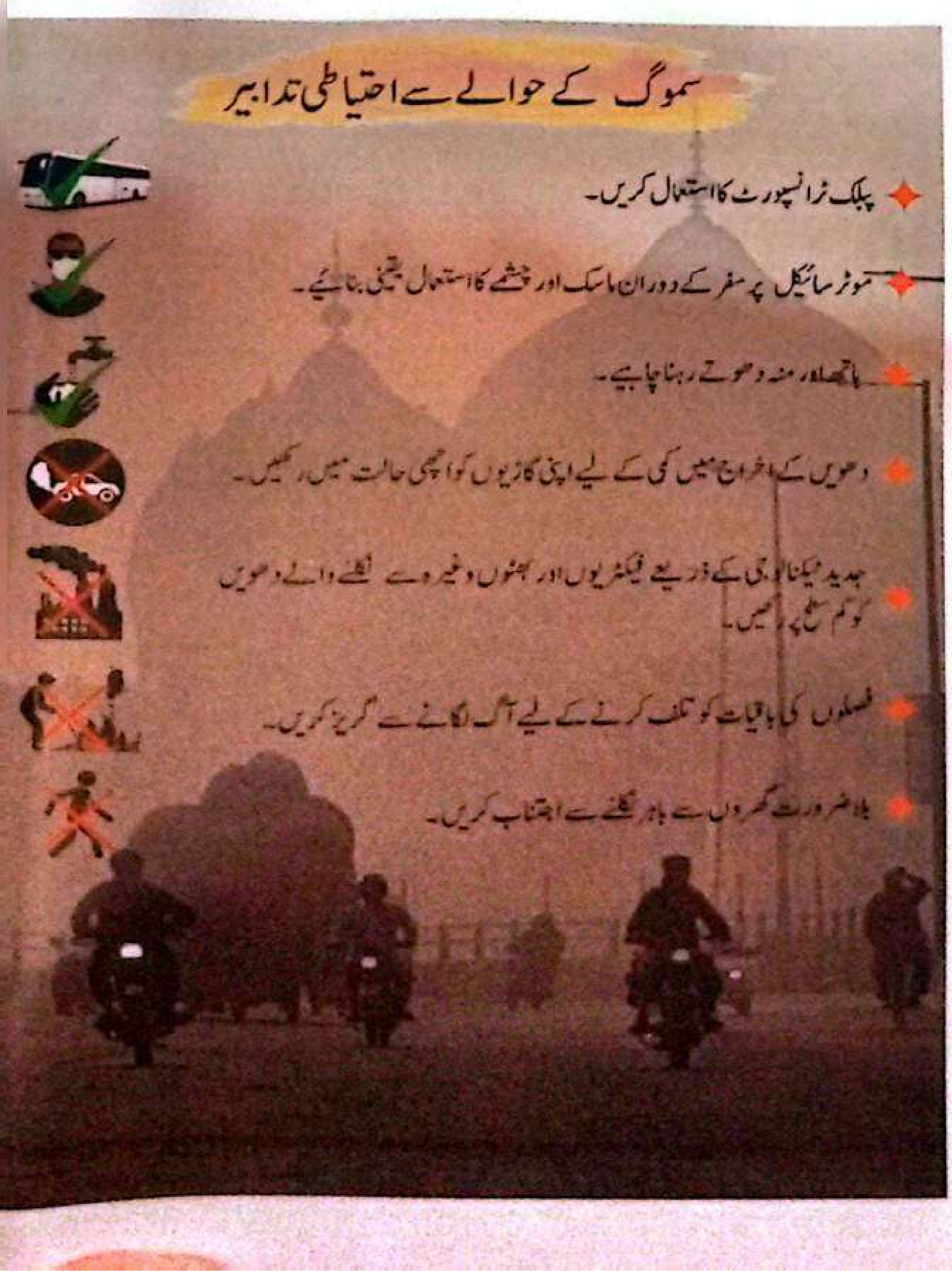

''سموگ کے دنوں میں ہمیں کیا احتیاط کرنی چاہیے؟'' خضر نے پوچھا۔

''ہمیں ایسے موسموں میں بلا ضرورت باہر نکلنے سے پرہیز کرنا چاہیے، گھروں کے دروازے، کھڑکیاں بند رکھنی چاہییں، آلودگی زیادہ ہو تو ماسک کا استعمال بھی کرنا چاہیے اور منہ، ہاتھ دھوتے رہنا چاہیے۔'' عمر صاحب نے انھیں سمجھایا۔

''ہمارے ٹیچر کہہ رہے تھے آلودگی کے مسئلہ پر قابو پانے کے لیے ہمیں ری سائیکلنگ سے بھی کام لینا چاہیے۔'' خضر نے بتایا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہمیں کچرے، پلاسٹک اور دیگر فالتو اشیا کی ری سائیکلنگ بھی کرنی چاہیے'' عمر صاحب نے اتفاق کیا اور پھر گُل سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگے، '' آپ کو پتا ہے ری سائیکلنگ کیا ہوتی ہے؟''

''مجھے کچھ اندازہ ہے'' گُل بولی، ''استعمال شدہ اشیا کو دوبارہ استعمال کے قابل بنانا شاید ری سائیکلنگ کہلاتا ہے۔''

''بالکل درست کہا آپ نے۔ پلاسٹک، گتے، کاغذ، شیشے، لکڑی اور کپڑے سے بنی ہوئی اشیا کو کوڑے میں پھینک کر ضائع کرنے کی بجائے، تھوڑی سی کوشش سے انہیں الگ الگ کر کے دوبارہ کسی نہ کسی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوگا تو دوسری طرف بہت سا خام مال بھی دستیاب ہونا شروع ہو جائے گا۔'' عمر صاحب بولے۔

''بچوں کو تیزابی بارش اور گرین ہاؤس گیسوں کے بارے میں بھی بتائیے۔'' ڈاکٹر شہناز جو کافی دیر سے عمر صاحب اور بچوں میں ہونے والی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھیں، کہنے لگیں۔

''مجھے صبح کے لیے انڈے اور ڈبل روٹی لانا ہے، آپ انھیں سمجھا دیجیے۔'' عمر صاحب نے کپڑے کا تھیلا پکڑا اور قریبی مارکیٹ جانے کے لیے پیدل ہی باہر نکل گئے۔ وہ سب گھر والے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ پلاسٹک کے شاپنگ بیگ یا شاپر آسانی سے تحلیل نہیں ہوتے، زمینی آلودگی کا باعث بنتے اور سیوریج سسٹم اور پانی کے بہاؤ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اس لیے وہ ہر ممکن ان کے استعمال سے اجتناب کرتے اور اپنے رشتہ داروں، دوستوں حتیٰ کہ دُکان داروں کو بھی، ایسا ہی کرنے کا کہتے تھے۔

کچرا جمع کرنے کا طریقہ

مشق

سوال:

1. آلودگی کی کون کون سی اقسام ہیں؟ ان کی وجوہات بیان کریں۔
2. سموگ کیا ہے؟ اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟
3. سائیکل کے استعمال کے کم از کم تین فوائد بیان کیجیے۔
4. ری سائیکلنگ سے کیا مراد ہے؟ مثال کی مدد سے واضح کریں۔
5. پلاسٹک کے بنے شاپنگ بیگ کے استعمال میں کیا کیا قباحتیں ہیں؟

سکول کا کام

سکول انچارج کی مدد سے کچرے اور فالتو اشیا کو پھینکنے کے لیے سکول میں موزوں جگہ پر مختلف رنگوں کی ٹوکریاں رکھوائیے، سبز رنگ کی ٹوکری بچی کھچی خوراک، پھل اور پتوں، سُرخ رنگ کی پلاسٹک، دھات اور شیشے کی اشیا، نیلے رنگ کی کاغذات، اخبارات اور لفافوں وغیرہ کے لیے اور اگر ضروری ہو تو سیاہ رنگ کی ٹوکری دیگر فالتو اشیا کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اپنی جماعت کے طلبہ کے ذریعے پورے سکول کے طلبہ کو انھیں استعمال کرنے کی ترغیب دیجیے اور یاددہانی کرواتے رہیے۔

گھر کا کام

بچے مشاہدہ کریں کہ ان کے گھر میں ہونے والی کون کون سی سرگرمیاں آلودگی میں اضافے کا باعث بن رہی ہیں اور کاپی میں ان کی فہرست بنا کر لائیں۔ کلاس میں بچوں کا مباحثہ کروائیے کہ ان سرگرمیوں سے کس طرح بچا جا سکتا ہے یا کمی لائی جا سکتی ہے۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کیجیے کہ بہتری کے ان اقدامات کو اپنے گھر والوں کی مدد سے گھر میں متعارف کروائیں۔ اس حوالہ سے کچھ دنوں کے وقفوں سے کلاس میں ایک منظم سرگرمی کروائیے اور بچوں کو اپنے اپنے گھروں میں ہونے والی پیش رفت بیان کرنے کا موقع دیجیے۔

موسمیاتی تبدیلی (۳)

''میں تمھیں بتاتی ہوں تیزابی بارش کیا ہوتی ہے اور گرین ہاؤس گیسیں بھی'' ڈاکٹر شہناز نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں عمر صاحب چھوڑ کر گئے تھے، '' گاڑیوں اور فیکٹریوں وغیرہ کے دھویں سے فضا میں سلفر ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن آکسائیڈ گیسوں کا اخراج ہوتا ہے۔ یہ گیسیں فضا میں موجود پانی کے قطروں کے ساتھ مل کر تیزابی بارش کا باعث بنتی ہیں۔''

''تو کیا تیزابی بارش نقصان دہ ہوتی ہے؟'' خضر نے پوچھا۔

''تیزابی بارش پانی کو آلودہ کر دیتی ہے اور آبی حیات کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ فصلوں اور پودوں کے لیے بھی نقصان دہ ہوتی ہے۔ عمارات اور دیگر تعمیرات کی بیرونی دیواروں کو بھی تیزابی بارش نقصان پہنچاتی ہے۔ لوہے کی بنی ہوئی اشیا کو بھی زنگ لگنے کا باعث بنتی ہے۔'' ڈاکٹر شہناز نے وضاحت سے بیان کیا۔

''آپ گرین ہاؤس گیسوں کے بارے میں بھی بتانا چاہ رہی تھیں؟'' گل نے یاد کروایا۔

''اچھا پہلے تم لوگ مجھے بتاؤ، تمھیں پتا ہے گرین ہاؤس کیا ہوتا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

دونوں بچوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

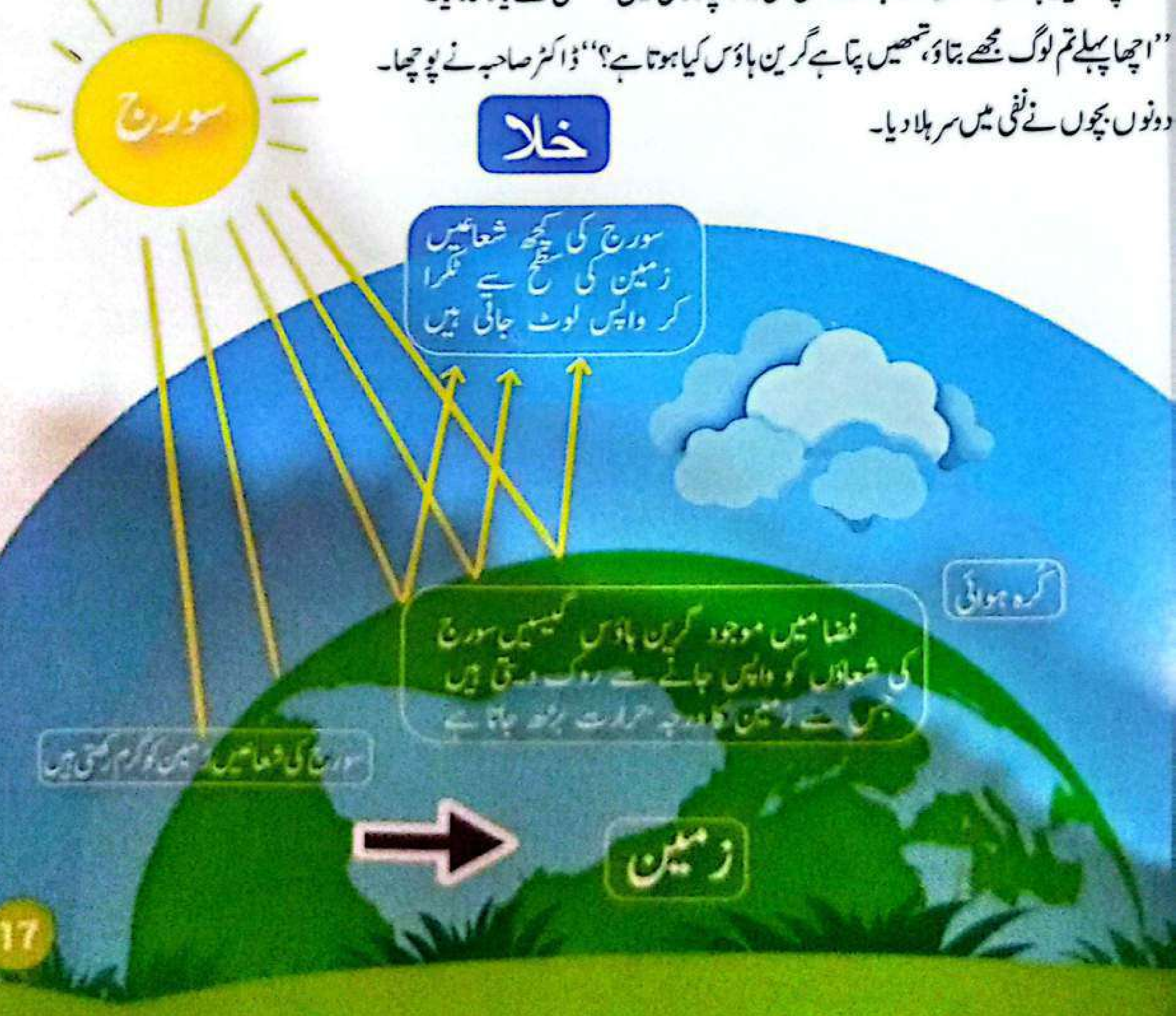

''گرین ہاؤس شیشے کے بنے ہوئے ایسے ہال ہوتے ہیں جو آج کل زراعت میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ سورج کی گرم شعاعوں کو اپنے اندر قید کر لیتے ہیں جس سے اندر کا ماحول باہر کی نسبت گرم ہو جاتا ہے اور پھر ایسے پودوں کو اُگایا جا سکتا ہے جو گرمی میں پھلتے پھولتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا۔
خضر کو یاد آ گیا کہ اس نے اپنی سائنس کی کتاب میں بھی اس کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔
''مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب انسانی سرگرمیوں کے نتیجہ میں فضا میں نقصان دہ گیسیں خارج ہوتی ہیں۔ یہ گیسیں، خاص طور پر کاربن ڈائی آکسائیڈ، جب ایک حد سے بڑھ جائیں تو گرین ہاؤس کی طرح کام کرتی ہیں۔ یعنی سورج کی گرم شعاعوں کو واپس جانے سے روک لیتی ہیں جس سے دنیا کا درجۂ حرارت بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ درجۂ حرارت بڑھنے سے اور بہت سی قباحتیں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے بات جاری رکھی۔
''مثلاً؟'' گُل متجسس انداز میں بولی۔
''مثلاً یہ کہ دنیا میں موجود برف کے بڑے بڑے ذخائر اور گلیشیئر پگھلنا شروع ہو جاتے ہیں جس سے سطحِ سمندر بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے اور سمندر کی سطح بلند ہونے سے مزید زمین زیرِ آب آ جاتی ہے۔ بعض اوقات تو لوگوں کو اس کی وجہ سے نقل مکانی بھی کرنا پڑتی ہے۔ جانوروں کے مسکن الگ تباہ ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے جواب دیا۔
جانوروں کی مشکلات کا سُن کر خضر اور گُل ہمیشہ پریشان ہو جایا کرتے تھے سو اَب بھی ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے۔
''زیادہ درجۂ حرارت پودوں اور فصلوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور ان کی پیداوار کو متاثر کرتا ہے جس کے نتیجہ میں خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی سر اُٹھانے لگتا ہے'' ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی بات جاری رکھی، ''ایک طرف سیلاب، سونامی، طوفان جیسی قدرتی آفات بڑھ جاتی ہیں تو دوسری طرف بارشوں کی کمی اور قحط سالی جیسے حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔''
''یہ سونامی کیا ہوتا ہے؟'' گُل نے پوچھا۔
''زمین پر آنے والے زلزلوں سے تو آپ لوگ واقف ہی ہیں، سونامی سے مراد وہ زلزلہ ہے جو زیرِ آب آتا ہے اور جس کے نتیجہ میں اٹھنے والی انتہائی بلند سمندری لہریں ساحلی علاقوں کو نیست و نابود کر ڈالتی ہیں۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا۔
''پاکستان کو سب سے زیادہ خطرہ کس قدرتی آفت سے ہے؟'' خضر نے سوال اٹھایا۔
''بھئی، قدرتی آفت کی بابت کوئی پیش گوئی کرنا تو مشکل ہے لیکن میری رائے میں پاکستان کو کسی بھی قسم کی قدرتی آفت کی نسبت زیرِ زمین پانی کی گرتی ہوئی سطح سے سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ آنے والے سالوں میں ہمیں پانی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحبہ بولیں۔
''اس صورتحال سے بچنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟'' خضر کا سوال برمحل تھا۔
''ہمیں ہر وہ کام کرنا ہوگا جس سے پانی کی بچت ہو سکے۔ پانی کے بے جا استعمال اور ضیاع کو روکنا ہوگا۔ اس حوالہ سے ہر شخص کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے جواب دیا۔
''ہم بچے اس سلسلہ میں کیا کر سکتے ہیں؟'' اس دفعہ سوال پوچھنے کی باری گُل کی تھی۔
''اچھا سوال ہے'' ڈاکٹر صاحبہ بھی سوچ میں پڑ گئیں، ''آپ یوں کر سکتے ہیں کہ نہاتے ہوئے شاور کے بجائے ٹب کا استعمال کریں، ابو کے ساتھ گاڑی

ہوتے ہوئے کھلے پانی کے بجائے پانی کی بالٹی کا استعمال کریں، دانت صاف کرتے ہوئے پانی کی ٹونٹی کو بند رکھا کریں، کُلی کرنے کے لیے مگ یا گلاس کا استعمال کیا کریں۔ ویسے بھی گھر، سکول یا کسی بھی جگہ کسی ٹونٹی، نل یا شاور کو لیک ہوتا دیکھیں تو ٹھیک کرنے کی کوشش کریں یا کسی بڑے کو آگاہ کریں۔''

'ویسے تو ہم بہن بھائی یہ سارے کام ایسے ہی کرتے ہیں لیکن یہ سننے کے بعد اب زیادہ احتیاط کیا کریں گے۔'' خضر نے یقین دہانی کروائی۔

بچے انتہائی توجہ سے یہ گفتگو سن رہے تھے کہ اچانک ڈاکٹر صاحبہ نے پوچھ لیا ''ڈینگی کی بیماری کیسے پھیلتی ہے؟''

''مَیں بتاؤں، مچھر سے۔'' گُل جھٹ سے بولی۔

''جواب دُرست ہے۔ آپ کو پتا ہے سردی کے موسم میں مچھر مر جاتا ہے لیکن اب چونکہ موسمیاتی تبدیلی کی وجہ سے موسمِ گرما طویل ہو جاتا ہے یہ مچھر بھی زیادہ دیر زندہ رہتا ہے اور ملیریا اور ڈینگی کا باعث بنتا ہے۔'' ڈاکٹر شہناز نے وضاحت سے جواب دیا۔

''کیا آپ کو ان مچھروں کا فرق بھی پتا ہے؟'' ڈاکٹر صاحبہ گُل سے گویا ہوئیں۔ گُل نے نفی میں سر ہلا دیا، البتہ خضر بول اٹھا ''ملیریا پھیلانے والا مچھر گندے پانی میں پھلتا پھولتا ہے جبکہ ڈینگی والے مچھر کی افزائش صاف پانی میں ہوتی ہے۔''

''جی بالکل، اسی لیے تو کہتے ہیں ڈینگی پھیلنے کے موسم میں پانی کی ٹینکیوں، بالٹیوں وغیرہ کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ گملوں میں، کیاریوں میں اور دیگر جگہوں پر پانی کو کھڑا نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اپنے گھر بار اور اطراف کو صاف رکھنا چاہیے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا۔

''اچھا، بات ہو رہی تھی درجہ حرارت بڑھ جانے کی'' ڈاکٹر شہناز نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے ایک اور سوال اٹھا دیا، ''جب گرمی بڑھ جاتی ہے تو ہم

معلوماتی چارٹ برائے ڈینگی

انسان کس طرح اس کا سامنا کرتے ہیں؟''

''پنکھا چلا کر۔'' گُل بولی۔

''اور جب گرمی بہت بڑھ جائے؟'' ڈاکٹر شہناز نے اگلا سوال کیا۔

''پھر ایئر کنڈیشنر چلا کر۔'' گُل نے جواب دیا۔

''آپ کو پتا ہے یہ ہمارا سورج ہمیں صرف فائدہ ہی نہیں دیتا بلکہ مُضر شعاعیں بھی خارج کرتا ہے لیکن کرۂ ارض میں موجود اوزون نامی گیس ہماری زمین کو ڈھانپے رکھتی ہے اور ان خطرناک شعاعوں کو ہم تک نہیں پہنچنے دیتی۔ جب زیادہ گرمی میں ہم فریج اور ایئر کنڈیشنر وغیرہ زیادہ استعمال کرتے ہیں تو ان سے خارج ہونے والے ایک کیمیکل کلورو فلورو کاربن کا تناسب بھی فضا میں بڑھ جاتا ہے۔ یہ اوزون کی تہہ کو نقصان پہنچاتا ہے جس سے سورج کی خطرناک شعاعیں بھی زمین تک پہنچنے لگ جاتی ہیں اور ضرر پہنچانا شروع کر دیتی ہیں۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے وضاحت کی۔

''اوزون کی تہہ کو کیسے بچایا جا سکتا ہے؟'' خضر نے سوال پوچھا۔

''ہمیں نقصان دہ گیسوں کے اخراج میں کمی لانا ہوگی'' ڈاکٹر صاحبہ اٹھتے ہوئے بولیں، ''اور درختوں کو بھی بڑھانا ہوگا۔''

اس تفصیلی گفتگو کے بعد ڈاکٹر شہناز اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں لیکن بچے موسمیاتی تبدیلی اور اس کے پیچھے کارفرما عوامل سے اب اچھے خاصے واقف ہو چکے تھے۔ انھوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک بَن پڑے وہ موسمیاتی تبدیلی کو روکنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ آخر یہ دنیا ہمارا گھر ہے اور اس میں رہنے والے سب چھوٹے بڑے لوگوں کو مل کر ہی اپنے گھر کو ایسے خطرات سے بچانا ہوگا۔

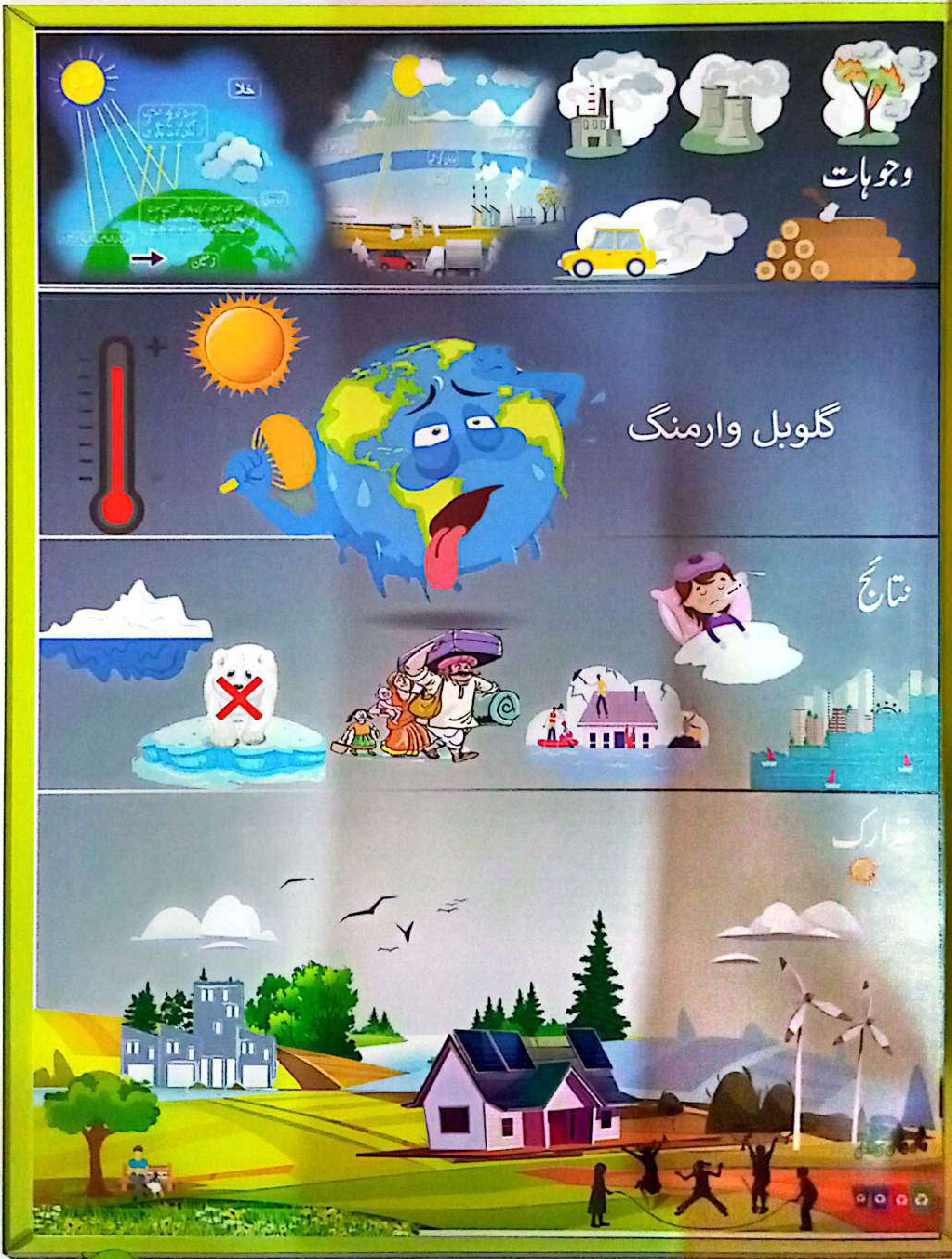

وجوہات
گلوبل وارمنگ
نتائج
تدارک

مشق

سوال:

1. گرین ہاؤس گیسیں کون کون سی ہوتی ہیں؟ وہ کس طرح سے درجہ حرارت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں؟
2. زمین کا درجہ حرارت بڑھنے سے ہمیں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
3. پانی کے بے جا استعمال اور ضیاع کو روکنے کے لیے شہری ہر سطح پر کیا کیا اقدامات کر سکتے ہیں؟
4. کیا وجہ ہے کہ حالیہ برسوں میں ڈینگی نام کی بیماری بہت پھیل رہی ہے؟ ڈینگی مچھر سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟
5. اوزون کیا ہے؟ کرۂ ارض میں اس کا کیا کردار ہے؟ اوزون کو کن انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے نقصان پہنچ رہا ہے؟

عملی کام

سکول کا کام

ڈینگی کے پھیلاؤ کے دنوں میں ہفتم جماعت کے بچوں سے پورے سکول کا معائنہ کروائیے اور انھیں ان سرگرمیوں اور جگہوں کی نشان دہی کرنے کا کہیے جو ڈینگی مچھر کی افزائش کا باعث بنتی ہیں۔ ان ٹونٹیوں، نلوں اور پائپوں کی بھی نشان دہی کرنے کا کہیں جو لیک ہو رہے ہوں۔ بعدازاں جماعت کی جانب سے سفارشات مرتّب کر کے انچارج سکول کو پیش کیجیے۔ اس کے علاوہ اپنی جماعت کے مختلف طلبہ کو سکول کی دیگر جماعتوں میں بھجوا کر ڈینگی مچھر اور اس سے بچنے کے طریقۂ کار کی بابت بھی آگاہی دیجیے۔

گھر کا کام

موسمیاتی تبدیلی کے موضوع پر تینوں ابواب پڑھ لینے کے بعد، کسی ہفتہ وار چھٹی کے روز بچوں کو گھر سے ایک ایسا چارٹ بنا کر لانے کا کہیے جو جنگلات کی کٹائی، گرین ہاؤس گیسوں، اوزون کو پہنچنے والے نقصان، گلوبل وارمنگ جیسے موسمیاتی تبدیلی کے عوامل کا آپس میں تعلق ظاہر کرے۔ تین بہترین چارٹ تیار کرنے والوں کو انعام دیجیے۔

پانی کہانی

''دریائے سندھ مر رہا ہے۔'' عمر صاحب نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔۔۔کون مر رہا ہے؟'' ڈاکٹر شہناز ایک دم پریشان ہوگئیں۔ بچّے بھی چونک گئے۔ خضر نے ٹی وی کی آواز بند کر دی اور اپنے والد کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''پانچ ہزار سال تک اس دھرتی کو زندگی بخشنے والا دریائے سندھ اس دھرتی پر بسنے والوں کی بے حسّی اور بے اعتنائی کے سبب اب خود مر رہا ہے۔'' عمر صاحب نے وضاحت کی۔ وہ اخبار میں شاید کوئی رپورٹ پڑھ رہے تھے۔

''کیوں کیا ہوگیا؟'' خضر نے سوال اٹھایا۔

''ہونا کیا ہے، وہی موسمیاتی تبدیلی کا مسئلہ'' عمر صاحب بولے، ''ایک طرف درجہ حرارت بڑھنے سے وہ گلیشیر پگھلتے جا رہے ہیں جن سے یہ دریا پانی لیا کرتا تھا تو دوسری طرف کون سی قسم کی آلودگی نہیں جو ہم پاکستانی اس میں نہیں ڈالتے۔ سیوریج کا پانی، صنعتوں کا فُضلہ، کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویات کی باقیات، اور تو اور پلاسٹک کا کوڑا کرکٹ۔'' سب لوگ خاموشی اور سنجیدگی سے عمر صاحب کی بات سننے لگے، ''عالم یہ ہے کہ پلاسٹک کے کوڑا کرکٹ پھینکے جانے کے حوالہ سے دریائے سندھ، دُنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ تقریباً دو لاکھ ٹن کے لگ بھگ یہ دریا پلاسٹک کا کچرا سمندر میں لے کر جاتا ہے۔ اس کا اپنا تو بیڑا غرق ہوتا ہی ہے، سمندری حیات کو بھی بے انتہا نقصان پہنچتا ہے۔''

''ابّو! یہ اتنا پرانا دریا ہے؟'' گُل کے ذہن میں ابھی بھی پانچ ہزار سال پھنسے ہوئے تھے۔

''جی بالکل، آثار بتاتے ہیں کہ وہ جو ہم نے ہڑپہ اور موہنجوداڑو جیسے شہروں کے کھنڈرات دیکھ رکھے ہیں وہ اس کے کناروں پر تقریباً اڑھائی تین ہزار سال قبل مسیح کے دور میں آباد تھے۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

''آپ بچوں کو اس دریا کی موجودہ پاکستان کے لیے اہمیت سے بھی آگاہ کریں۔'' ڈاکٹر شہناز نے تجویز دی۔

''تو سنیں! نکلتا تو یہ چین میں تبت کے مقام سے ہے لیکن یہ تقریباً تین ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے، پاکستان میں سے گزر کر بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ پاکستان کی نوے فیصد آبادی اس کے اطراف میں بستی ہے اور اس سے مُستفید ہوتی ہے۔ پاکستان کے دس بڑے شہروں میں سے نو، اس سے زیادہ سے زیادہ پچاس کلومیٹر کی مسافت پر آباد ہیں۔ ہم ایک زرعی مُلک ہیں اور ہماری 80 فیصد زراعت کا دارومدار اس کے پانی پر ہے۔ ہمارے نہری نظام کا شمار دُنیا کے سب سے بڑے اور بہترین نہری نظاموں میں ہوتا ہے، اس کا انحصار بھی دریائے سندھ پر ہی ہے۔ ہمارے زیرِ زمین پانی کے ذخائر بھی زیادہ تر اسی کی بدولت ہیں۔ تربیلا ڈیم جو کہ مُلک کا سب سے بڑا بند ہے، وہ بھی اسی دریا پر واقع ہے۔ گویا مُلک کے لیے بجلی پیدا کرنے میں بھی دریائے سندھ کا ایک اہم کردار ہے۔ پرندوں اور آبی حیات کی بہت سی اقسام اس کے دَم سے ہی زندہ ہیں اور پھلتی پھولتی ہیں۔'' عمر صاحب نے تفصیلاً بتایا۔

''ابو! یاد ہے ناں جب ہم ڈیرہ غازی خان گئے تھے تو آپ ہمیں دریا کنارے بغیر آنکھوں والی انڈس ڈولفن بھی دکھانے لے گئے تھے جو دنیا میں کسی اور جگہ ہے بھی نہیں۔'' خضر پُر جوش انداز میں بولا۔

''جی ہاں! لیکن افسوس کہ اس قدر نایاب مچھلی بھی اب تیزی سے معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے۔'' عمر صاحب نے تاسّف سے سر ہلایا۔

بچوں پر اب خاصی حد تک دریائے سندھ کی اہمیت واضح ہو چلی تھی لیکن وہ اب بھی موسمیاتی تبدیلی اور دریائے سندھ کے باہمی تعلق کو پوری طرح نہ سمجھ سکے تھے۔

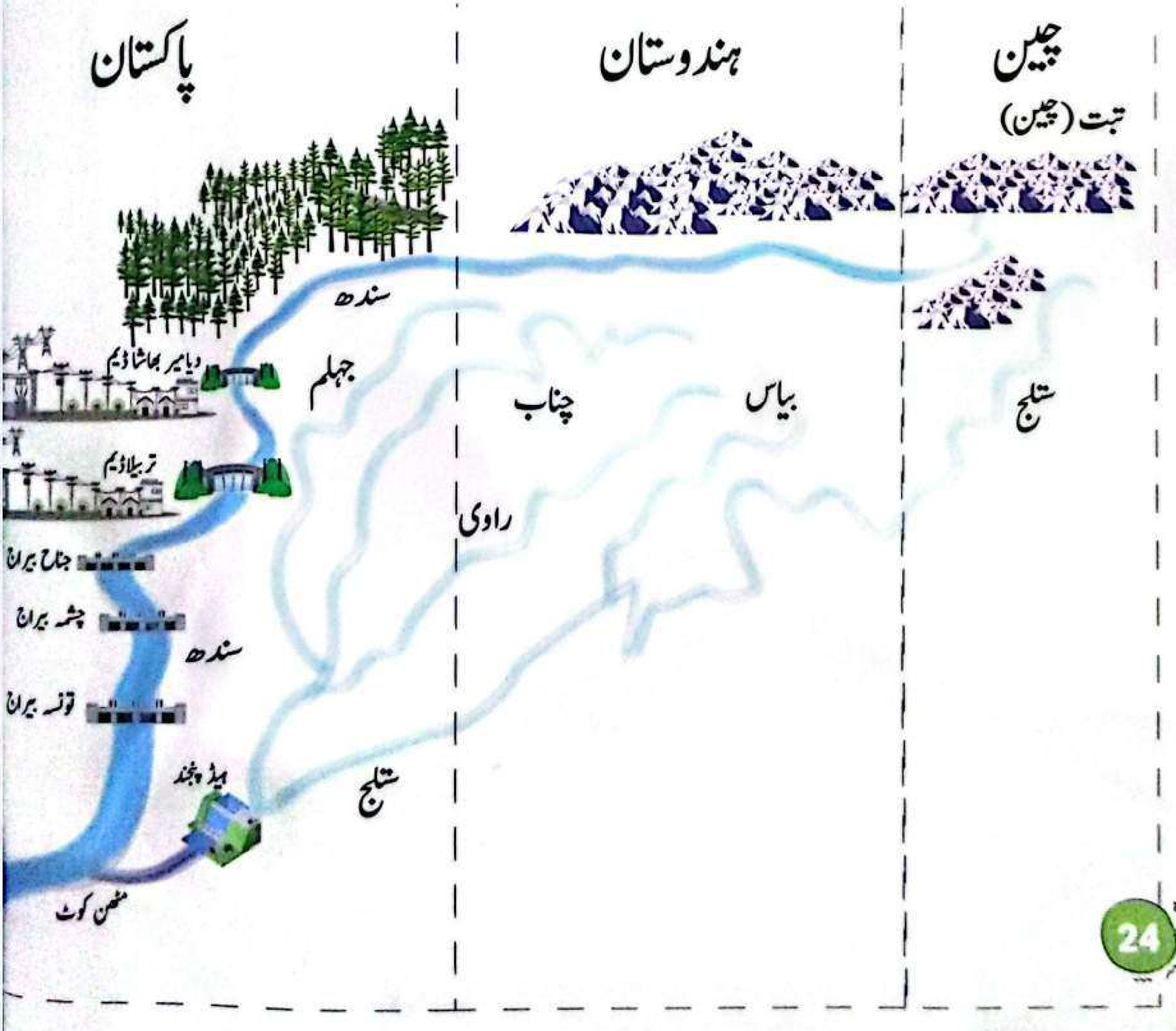

عمر صاحب انھیں بتانے لگے کہ گلیشیر پگھلنے سے بعض اوقات اچانک دریا میں سیلابی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے، جس سے آس پاس کی آبادیوں کو جانی و مالی نقصان پہنچتا ہے۔ اور یہ بھی کہ جس تیزی سے گلیشیر پگھل رہے ہیں، آنے والے وقتوں میں تو دریا میں پانی کی کمی واقع ہو جائے گی۔ اور پانی کی کمی سے پیدا ہونے والے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ، سمندر کا نمکین پانی ساحلی علاقوں میں سرایت کرتا چلا جا رہا ہے، مینگروز جنگلات الگ تباہ ہو رہے ہیں۔ ایک طرف دریاؤں میں پانی کی کمی کا سامنا ہے تو دوسری طرف آبادی اور اس کی پانی کی ضروریات ہیں کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔

''میں نے پڑھ رکھا ہے کہ آزادی کے وقت پاکستان میں اوسطاً ہر شخص کو پانچ ہزار مکعب میٹر پانی مہیا تھا'' اس دفعہ ڈاکٹر شہناز نے گفتگو میں اپنا باقاعدہ حصہ ڈالا، ''جس تیزی سے پانی کم ہوتا چلا جا رہا ہے 2025ء کے لگ بھگ یہ اوسط پانچ سو مکعب میٹر، یعنی دس گنا تک کم ہو چکی ہوگی۔ گویا دوسری ضروریات تو ایک طرف، ہم پینے کے پانی کو بھی ترس جائیں گے۔''

''دریائے سندھ کو بچانے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' گُل کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

''ہمیں سمجھنا ہوگا کہ موسمیاتی تبدیلی ہمارے لیے کسی بھی اندرونی و بیرونی خطرے اور دشمن سے بڑھ کر ہے۔ ہمیں ہر وہ کام کرنا ہوگا جس سے یہ تبدیلی تھم سکے۔ ترقی کے نام پر شہروں کو سیمنٹ اور کنکریٹ کے جنگل بننے سے روکنا ہوگا، درخت لگانا ہوں گے، انھیں کٹنے سے بچانا ہوگا، کیمیائی کھادوں اور ادویات سے بچتے ہوئے نامیاتی کاشت کاری پر انحصار کرنا ہوگا، فضا میں مضر گیسوں کے اخراج کو روکنا ہوگا، ہر قسم کی آلودگی پھیلانے سے بچنا ہوگا، آلودہ پانی کو بھی نالوں اور دریاؤں میں براہ راست شامل ہونے سے روکنا ہوگا، آلودہ پانی کو صاف کرنے کا نظام متعارف کروانا ہوگا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ تقریباً چار سو شہروں میں سے محض آٹھ میں فاضل پانی کو صاف کرنے کا نظام موجود ہے اور وہ بھی پوری طرح زیرِ استعمال نہیں۔'' عمر صاحب نے پل بھر کو توقف کیا اور پھر اپنی بات دوبارہ شروع کی، ''اسی طرح پلاسٹک کے استعمال اور اسے ٹھکانے لگانے کے طریقۂ کار پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی حوالہ سے ری سائیکلنگ کے رواج کو بہت فروغ دینا پڑے گا۔''

''اس سب سے کیا ہوگا؟'' گُل کا چھوٹا سا ذہن شاید مزید وضاحت مانگ رہا تھا۔

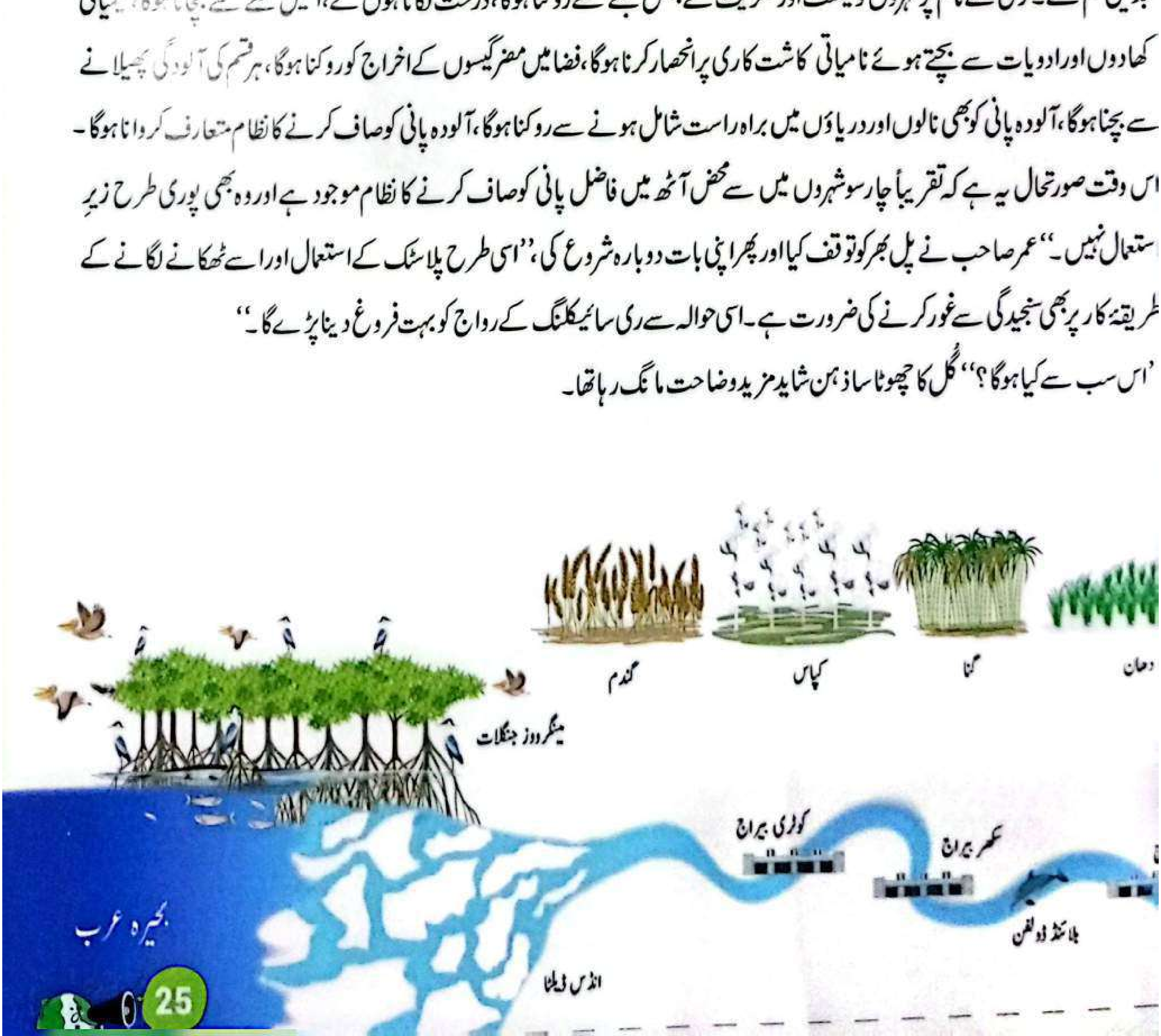

دریائے سندھ کی صورت حال کی منظر کشی کرتی دو تصاویر: پہلی تصویر میں دریا میں پانی رواں دواں نظر آ رہا ہے۔ دوسری تصویر مئی 2022 کے اوائل میں لی گئی ہے جس میں دریا ریگ زار کا منظر پیش کر رہا ہے۔ عقب میں جامشورو شہر کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

''اس سے ایک طرف تو موسمیاتی تبدیلی کا عمل تھم سکتا ہے تو دوسری طرف دریائے سندھ کو براہ راست نقصان پہنچانے والے عوامل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

''لیکن یہ سب کام ہمارے کرنے کے تو نہیں ہیں۔'' خضر کے اعتراض میں وزن تھا۔

''ارے! ہمارا تو سارا تکیہ ہی نوجوان نسل پر ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ کام ہمارے کرنے کے نہیں'' عمر صاحب مسکراتے ہوئے کہنے لگے، ''یہ درست ہے کہ بنیادی طور پر یہ ذمہ داری حکومت اور اس کے اداروں کی ہے کہ دریائے سندھ کی بحالی کے لیے ایک جامع منصوبہ کی تیاری اور نفاذ پر کام کرے۔ مروّجہ قوانین کو بھی نظرِ ثانی کی اور بہتر بنانے کی ضرورت ہوگی۔ مزید قانون سازی بھی کرنا پڑ سکتی ہے۔ متعلقہ محکموں کو بھی متحکم اور متحرک کرنا ہوگا۔ تعلیمی اداروں کو بھی نوجوانوں میں، اس معاملہ میں آگہی اور شعور پھیلانے کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔ یہ پوری قوم کی بقاء کا مسئلہ ہے اور قوم کے ہر فرد کو اس حوالہ سے اپنا کردار پہچاننا اور ادا کرنا ہوگا۔ ہم تو انتظار کی عیاشی کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ وقت ہاتھ سے پھسلتا چلا جا رہا ہے۔ دریائے سندھ دھیرے دھیرے مر رہا ہے۔ ہمیں اسے بچانا ہوگا۔ ہمیں اسے اس لیے بھی بچانا ہوگا کہ اگر ہم اسے بچائیں گے، زندگی دیں گے تو یہ ہمیں زندگی دے گا کہ پانی زندگی ہے۔''

''جیسا یہ پانچ ہزار سال سے کرتا آیا ہے۔'' گُل نے لقمہ دیا۔

''درست! لیکن اب یہ دریا شاید مزید سو سال بھی نہ جی سکے، ہمیں کیا زندگی دے گا؟'' عمر صاحب کے اس جواب نے ماحول کو خاصا سنجیدہ بنا دیا۔

''اور پھر دریائے سندھ ہی کیا، ہمارے ہر ندی نالے کو کم و بیش ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے۔ ہمارے تو سارے پانی کی یہی کہانی ہے۔'' ڈاکٹر شہناز کے اس تبصرہ نے ماحول کی سنجیدگی میں اور اضافہ کر دیا۔

''بس اب ہر پاکستانی کو پانی کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا اور اس کے استعمال کے حوالہ سے اپنے رویے کو بدلنا ہوگا، اس کے لیے آواز اٹھانی ہوگی'' عمر صاحب چہرے پر مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بچوں سے پوچھنے لگے، ''کچھ سمجھ میں آیا؟''

''جی بالکل! سمجھ آیا'' خضر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا، ''نہ صرف ہماری سمجھ میں آیا بلکہ اب اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو بھی سمجھائیں گے۔''

ان سب کے چہروں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں امید کی کرن جگمگانے لگی۔

مشق

سوال:

1. دریائے سندھ پاکستان کے رہنے والوں کو کس کس طرح سے مُستفید کرتا ہے؟
2. دریائے سندھ کی بقا کو لاحق خطرات کی نشان دہی کریں۔
3. موسمیاتی تبدیلی اور دریاؤں کے باہمی تعلق کو واضح کیجیے۔
4. دریائے سندھ کو بچانے کے لیے حکومتی سطح پر کن اقدامات کی ضرورت ہے؟
5. دریاؤں کو رواں دواں رکھنے کے حوالہ سے ایک عام پاکستانی، خاص طور پر ایک نوجوان، کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

عملی کام

سکول کا کام

اپنے ٹیچر کی نگرانی میں دیگر ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک خاکہ (ڈرامہ) تیار کیجیے۔ جس میں ایک طالب علم بوڑھے شخص کے روپ میں دریائے سندھ کا کردار ادا کرے۔ حکومت کے نمائندوں اور عام پاکستانیوں کے کردار بھی پیش کیجیے۔ باہمی مشاورت سے مزید کرداروں کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ڈرامہ پہلے کلاس میں، اور بعد ازاں اسے سٹوڈنٹ کونسل کے زیرِ اہتمام، سکول کے مرکزی ہال میں دیگر طلبہ کے لیے پیش کریں۔

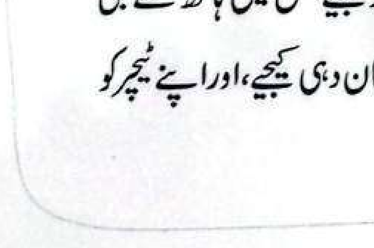

گھر کا کام

اپنے والدین کی نگرانی اور بہن بھائیوں کی معاونت سے ایک چارٹ تیار کیجیے جس میں ہاتھ سے بنی ہوئی تصاویر کی مدد سے دریائے سندھ کے فوائد اور اسے لاحق خطرات کی نشان دہی کیجیے، اور اپنے ٹیچر کو چیک کروائیے۔

سیلاب کی تباہ کاریاں

''ابو پانی رحمت ہوتا ہے کہ زحمت؟'' خضر کے اس سوال پر عمر صاحب چونک اٹھے۔ ''کیوں کیا ہوا، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''آپ کہتے رہتے ہیں ناں کہ ملک کو پانی کی کمی کا سامنا ہے لیکن ہماری ٹیچر تو بتا رہی تھیں کہ پاکستان میں شدید سیلاب آیا ہوا ہے اور پاکستان کا ایک بڑا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔'' خضر نے وضاحت کی۔

''ٹیچر بھی ٹھیک کہتی ہیں اور میں بھی'' عمر صاحب کہنے لگے، ''یہ دونوں مختلف باتیں ہیں اور ایک طرح سے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھی۔''

''وہ کس طرح؟'' دونوں بہن بھائی اب پوری طرح اپنے والد صاحب کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''دیکھو جب ہم کہتے ہیں کہ پاکستان کو پانی کی کمی کا سامنا ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ملک کے بہت سے حصوں میں خشک سالی کی سی کیفیت طاری رہتی ہے، بارشیں اپنے معمول سے کم ہوتی ہیں، اور زیرِ زمین پانی کی سطح خطرناک حد تک گرتی چلی جا رہی ہے۔ دوسری طرف وہ سیلابی صورتحال ہے جس سے اس وقت پنجاب کے جنوبی اضلاع، سندھ اور بلوچستان دوچار ہیں۔ اس سے پہلے یہ سیلابی پانی شمالی علاقہ جات اور خیبر پختونخوا میں بھی کافی تباہی پھیلا چکا ہے۔ خشک سالی ہو یا سیلاب، ان دونوں کے پیچھے وجہ ایک ہی ہے اور وہ ہے موسمیاتی تبدیلی۔ یہ تبدیلی کسی ایک شکل میں ظاہر نہیں ہوتی، کبھی یہ کم بارشوں کی صورت میں سامنے آتی ہے تو کبھی زیادہ بارشوں یا غیر موسمی بارشوں کی صورت میں۔'' عمر صاحب بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگے، ''ویسے اس بار موسمیاتی تبدیلی نے ہمیں دو طرح سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ ایک تو سردیوں کے بعد بہار کے بجائے سیدھی شدید گرمی کی ایک لہر آئی اور ہوا کے دباؤ کا کچھ ایسا سلسلہ بنا کہ غیر معمولی بارشیں ہوئیں۔ دوسرا اِس سے ہمارے پہاڑی سلسلوں کے گلیشیر بھی معمول سے بڑھ کر تیزی سے پگھلے۔ ان دونوں عوامل سے دریاؤں اور نالوں میں کچھ ایسی طغیانی آئی کہ راستے میں آنے والی ہر شے کو بہا کر لے گئے۔''

ہماری ٹیچر بھی بتا رہی تھیں سیلاب نے اس دفعہ پاکستان میں بہت تباہی پھیلائی ہے۔ گُل بھی گفتگو میں شریک ہوگئی۔

''ہاں بھئی، بہت تباہی آئی ہے۔ لاکھوں گھر تباہ ہوگئے، ڈھائی تین کروڑ لوگ گھر سے بے گھر ہوگئے، سینکڑوں لوگ جانوں سے بھی گئے، دس لاکھ کے لگ بھگ مویشی مارے گئے، کھڑی فصلیں ڈوب گئیں، ہزاروں کلومیٹر طویل سڑکیں تباہ ہوگئیں، بہت سے بند اور پُل بھی

سیلابی ریلوں میں بہہ گئے، کُل ملا کے اربوں کا نقصان ہوا۔'' عمر صاحب کے اس بیان پر بچے کچھ پریشان سے ہوگئے۔

''اس بات سے یاد آیا، امی آپ ہمیں ہمارے ان کپڑوں کا پیکٹ بنا دیں جو ہمیں چھوٹے ہوگئے ہیں۔ گھر میں موجود فالتو بستر بھی دے دیجیے گا اور سودا سلف بھی، بلکہ کچھ نقد رقم بھی۔ ہمارا سکول سیلاب زدگان کی مدد کرنے کے لیے کل کیمپ لگا رہا ہے۔'' گُل اپنی والدہ سے مخاطب ہوکر بولی۔

''یہ تو بڑا اچھا خیال ہے'' ڈاکٹر شہناز نے گُل کے جذبے کو سراہتے ہوئے کہا،''میں آج شام ہی پیکٹ بنائے دیتی ہوں۔ گھر میں پڑا سودا سلف بھی دے دیتی ہوں لیکن وہ شاید کچھ کم ہوگا، بازار سے اور بھی منگوائے دیتی ہوں۔''

''آپ کو پتا ہے سیلاب سے آنے والی اس تباہی میں خیر کا ایک پہلو بھی ہے۔'' عمر صاحب نے گفتگو کا رنگ بدلنے کی کوشش کی۔

بچے البتہ کچھ حیران ہوئے کہ اتنی بڑی تباہی کا کوئی مثبت پہلو کیسے ہوسکتا ہے۔

''ہمارے جیسے تو ایک عرصہ سے کہہ رہے تھے کہ موسمیاتی تبدیلی ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے لیکن پہلے جب کبھی موسمیاتی تبدیلی کا ذکر کیا جاتا تھا تو لوگ کان تک نہیں دھرتے تھے۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ موجودہ نسل محفوظ تھی اور موسمیاتی تبدیلی کے اگر کوئی بُرے ثرات مرتب ہونے بھی تھے تو ان کا سامنا آنے والی نسلوں کو کرنا تھا۔ سیلاب سے آنے والی حالیہ تباہی نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا

ہے۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، بلکہ بہت سوں نے تو بھگت بھی لیا کہ موسمیاتی تبدیلی درحقیقت ہوتی کیا ہے اور کیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' عمر صاحب بچوں کو سمجھانے لگے۔

''اس موضوع پر میں بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' ڈاکٹر شہناز کافی دیر سے باپ بچوں کی گفتگو توجہ سے سن رہی تھیں اور اب اس کا باقاعدہ حصہ بننا چاہ رہی تھیں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''یہ کہنا تو صحیح ہے کہ معمول سے زیادہ بارشوں اور دریاؤں میں طغیانی کے پیچھے موسمیاتی تبدیلی کارفرما ہے لیکن یہ کہہ دینا کہ ان بارشوں اور سیلاب کے نتیجہ میں آنے والی تباہی کا سبب بھی موسمیاتی تبدیلی ہے، کُلی طور پر درست نہ ہوگا۔ اس تباہی میں ہمارا بھی بہت بڑا حصہ ہے'' ڈاکٹر صاحبہ فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگیں، ''آج کل تو ویسے بھی جدید ٹیکنالوجی کی بدولت وقت سے بہت پہلے موسم کی بابت پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ اگر ہمیں پتا تھا کہ اس قدر بارشیں ہونے والی ہیں تو اس کی تیاری بھی اسی حساب سے کی جانی چاہیے تھی۔ متعلقہ محکموں کو متحرک ہونا تھا۔ لوگوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کیا جانا چاہیے تھا۔ خوراک، ادویات، رہائش کے متبادل انتظامات کیے جانے چاہیے تھے۔ لیکن ہماری قوم کا تو بدقسمتی سے یہ مزاج ہی بن چکا ہے کہ جب تک سر پر نہیں پڑتی، یہ بیدار نہیں ہوتی۔ اب سیلاب کو ہی دیکھ لیں، ہمیں ایسے سیلابوں کا ہر سال نہیں تو ہر دوسرے تیسرے سال سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تباہی تو ایک طرف، بہت سا قیمتی پانی سمندر میں گر کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب ہمیں پانی کی کمی کا بھی سامنا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم ہر سال سیلاب کے متاثرین کی بحالی پر کثیر وسائل اور رقم خرچ کرنے کے بجائے پیش بندی کرتے ہوئے انہی وسائل کو بہتر انداز میں استعمال کرتے۔ دریاؤں کے پشتے مضبوط کرتے، بند تعمیر کرتے، پانی کے ذخائر بناتے، نہریں نکالتے، فالتو پانی کے نکاس کا انتظام کرتے۔ ایسا کرنا تو ایک طرف، شہری منصوبہ بندی کا فقدان ہے، متعلقہ ادارے سوئے رہتے ہیں اور لوگ پانی کی گزرگاہوں، دریاؤں کے کناروں، بلکہ بعض اوقات تو ان کے بیچوں بیچ غیر قانونی تعمیرات کر لیتے ہیں۔ پانی کو اس کا راستہ کیا دینا ہے ہم تو اس کے لیے باقاعدہ رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں اور بعد میں نقصانات کا رونا روتے ہیں۔''

''اچھا اب آپ نے موضوع کو پھیلا ہی دیا ہے تو میری بھی کچھ سنیں'' عمر صاحب نے سب کو پھر سے اپنی طرف متوجہ کر لیا، ''اگرچہ ہم موسمیاتی تبدیلی سے متاثر ہونے والے اولین ممالک میں سے ہیں لیکن اس تبدیلی کا موجب بننے میں ہمارا حصہ ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ یہی حال ہمارے جیسے دوسرے ترقی پذیر ممالک کا ہے۔ اصل خرابی تو امریکہ، چین، روس حتیٰ کہ بھارت اور ان جیسے دوسرے بڑے

ممالک برپا کرتے ہیں جو دنیا بھر میں موسمیاتی تبدیلی کا باعث بننے والی مضر گیسوں کے تین چوتھائی حصے کے اخراج کا باعث بنتے ہیں، اور بھگتتے ہیں ہم جیسے دوسرے ممالک کہ جن کا نہ ہی موسمیاتی تبدیلی کا باعث بننے میں کوئی خاطر خواہ کردار ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے پاس اس کے نتائج اور اثرات سے نمٹنے کے وسائل ہوتے ہیں۔''

''یہ تو بہت بڑی ناانصافی ہے۔'' گُل کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔

''پاکستان کو بلکہ سب ترقی پذیر ممالک کو مل کر ان بڑے ممالک سے بات کرنی چاہیے۔'' ساتھ ہی ساتھ اس نے ایک مشورہ بھی دے ڈالا۔

''آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں'' اس کے والد نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، ''عالمی سطح پر اب 'موسمیاتی انصاف' کے نام سے ایک نئے نظریے کی وکالت کی جا رہی ہے جس کی رو سے جس ملک کا موسمیاتی تبدیلی لانے میں جس قدر کردار ہے، موسمیاتی تبدیلی کے مضر اثرات اور نتائج سے نمٹنے کے لیے بھی اس کو اتنی ہی ذمہ داری لینی چاہیے۔ اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے ممالک کو موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے نمٹنے کے لیے ان ترقی پذیر ممالک کی بھرپور مدد کرنی چاہیے جو اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔'' عمر صاحب نے وضاحت کی۔

''اس حوالہ سے میرا موقف تھوڑا سا مختلف ہے'' ڈاکٹر شہناز بول اٹھیں، ''دوسرے ملکوں کو ذمہ دار ٹھہرانے اور ان سے بات کرنے سے پہلے ہمیں اپنے معاملات کو سدھارنا ہوگا۔ درست ہے کہ موسمیاتی تبدیلی کا باعث بننے میں ہمارا کردار نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی اگر ہم اپنے درخت کاٹتے رہے، پانی کے وسائل ضائع کرتے رہے، فضا میں مضر گیسوں کے اخراج کا باعث بنتے رہے، تو ہمارے پاس کیا اخلاقی جواز ہوگا کہ ہم دوسرے ممالک کو اس سے روک سکیں۔''

سب نے اثبات میں سر ہلا دیے، ڈاکٹر شہناز کی اس بات سے بھلا کون اختلاف کر سکتا تھا

مشق

سوال:

1۔ کس صورتحال میں پانی لوگوں کے لیے رحمت کے بجائے ایک زحمت بن جاتا ہے ؟

2۔ موسمیاتی تبدیلی کس طرح سے سیلاب کا باعث بنتی ہے ؟

3۔ سیلاب سے آنے والی تباہی کے پیچھے موسمیاتی تبدیلی کے علاوہ مزید کیا عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟

4۔ ہم سیلاب اور ان سے آنے والی تباہی سے بچنے کے لیے کیا کیا اقدامات کر سکتے ہیں؟

5۔ 'موسمیاتی انصاف' کے تصور پر روشنی ڈالیے۔

عملی کام

سکول کا کام

اس باب کی تدریس کے بعد انچارج سکول کے زیرِاہتمام ساتویں کے طلبہ کو سکول کی باقی جماعتوں میں انفرادی طور پر یا چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں بھجوائیے جہاں وہ دیگر طلبہ کو پاکستان میں وقتاً فوقتاً آنے والے سیلابوں کی وجوہات اور ان سے بچنے کے اقدامات سے آگاہ کر سکیں۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیجیے کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر گھر میں موجود ضرورت کی فالتو اشیا مثلاً بستر، کپڑے، جوتے اور دیگر سودا سلف کے پیکٹ بنائیں اور اسے سیلاب متاثرین کی امداد یا کسی دیگر فلاحی مقصد کے لیے استعمال کریں۔

لان کی تیاری (۱)

خضر اور گُل کے گھر کا لان کوئی بہت سرسبز و شاداب اور خوش نُما نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لان اُن کے اِس گھر میں منتقل ہونے سے پہلے بنایا گیا تھا۔ اس میں گھاس بھی دیسی لگی ہوئی تھی جو بہت خُوش رنگ نہ تھی، اور زیادہ گرمی اور سردی میں مرجھا جایا کرتی تھی۔ عمر صاحب سوچتے رہتے تھے کہ انھیں اپنے لان کو ایک نئے سرے سے تیار کرنا چاہیے۔ دفتر میں کچھ چھٹیاں ملیں تو بچوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ طے یہ کیا گیا کہ معیاری گھاس لگائی جائے گی، پھول دار پودے اور درخت لگائے جائیں گے، دیواروں پر بیلیں چڑھائی جائیں گی اور اطراف میں باڑ لگائی جائے گی۔

عمر صاحب نے بچوں کو بتایا کہ شدید گرمی یا سردی کے موسم میں گھاس نہیں لگانا چاہیے، بہار کے موسم میں یا برسات کے شروع کے ایام گھاس لگانے کے لیے موزوں ترین ہوتے ہیں۔ گھاس کی قسم چُننے کا مرحلہ آیا تو بچوں سے پوچھنے لگے کہ یہ تو بتاؤ گھاس کے فوائد کیا ہیں خضر جلدی سے جواب دینے لگا تو عمر صاحب نے کہا: ”پہلے پوری طرح سوچو اور پھر جواب دو، جواب جلد دینے سے زیادہ اہم یہ ہوتا ہے کہ سوچ سمجھ کر بہتر جواب دیا جائے۔“

”گھاس میدان کو نرم کر دیتی ہے۔ کھیلتے ہوئے گرنے کی صورت میں چوٹ بھی نہیں لگتی اور آپ کے کپڑے بھی گندے نہیں ہوتے۔“ خضر سوچ کر بولا۔

”ابو! میرا خیال ہے گھاس لگانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آنکھوں کو بھلی لگتی ہے، انہیں ٹھنڈک دیتی ہے، لان بھی خوبصورت لگتا ہے اور گھر بھی۔“ گُل نے بڑوں کی طرح جواب دیا۔

”ٹھیک کہا تم نے، طبیعت اور مزاج پر اس کا بہت مثبت اثر پڑتا ہے“ عمر صاحب مسکراتے ہوئے بولے، ”بلکہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہوں یا کسی کام کے دباؤ میں ہوں اور ہری بھری گھاس کے لان میں نکل آئیں یا کسی پارک میں چلے جائیں تو دباؤ اور پریشانی کی شدت بھی کم ہو جاتی ہے۔“

”اور پھر گھاس باقی پودوں کی طرح ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرتی ہے اور آکسیجن خارج کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گھاس ہوا میں موجود گرد اور دیگر مُضر ذرّات کو بھی جذب کر کے ہوا کو صاف کرتی ہے اور ہمارے پھیپھڑوں کو ان کے نقصان سے بچاتی ہے۔“ عمر صاحب نے مزید بتایا۔

”ابو! گھاس کا ایک اور فائدہ بھی ہوتا ہے“ گُل بولی، ”اس پر چڑیا اور دوسرے پرندے چُگنے آتے ہیں۔“

”تمھاری امی تو کٹورے میں پانی بھی ڈال کر رکھ دیتی ہیں، اور وہ پانی پینے بھی آتے ہیں۔“ عمر صاحب نے گُل کی ہاں میں ہاں ملائی۔

طے پایا کہ اس سہ پہر وہ نرسری جا کر گھاس کی اقسام کی بابت معلومات حاصل کریں گے اور سب سے موزوں گھاس اپنے لان کے لیے منتخب کریں گے۔ نرسری کے مالک نصیر احمد، عمر صاحب کے دوست تھے۔ انہوں نے سب مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور نرسری کے عقبی حصہ میں گھاس دکھانے لے گئے۔

''یہ کورین گھاس کہلاتی ہے، تھوڑا آہستہ اُگتی ہے اس لیے زیادہ کٹائی نہیں مانگتی۔ اس کا قالین بڑا خوش نُما اور موٹا بنتا ہے۔''نصیر صاحب نے گھاس کی پہلی قسم دکھائی۔

''اس کی کوئی ایک اور قابلِ ذکر خوبی اور خامی بھی بتائیے۔'' عمر صاحب پوچھنے لگے۔

''خوبی یہ ہے کہ یہ دیوار اور درختوں کے سایہ میں بھی اُگ سکتی ہے، سردی کو بھی بہتر برداشت کرتی ہے، اور خامی یہ ہے کہ اس پر ننگے پاؤں چلنے پر یہ تھوڑا چُبھتی ہے۔'' نصیر صاحب نے جواب دیا۔

''یہ امریکن گھاس ہے۔ اس کے پتے پتلے اور نوکیلے ہوتے ہیں۔ یہ گھاس سارا سال سبز رہتی ہے اور سردی کو بہتر برداشت کرتی ہے، اسی لیے پارکوں اور کھیل کے میدانوں میں اسے لگاتے ہیں۔ لیکن اگر سردی کا موسم طویل ہو جائے اور کُہر زیادہ پڑ جائے تو یہ گھاس بھی متاثر ہو جاتی ہے۔''نصیر صاحب نے گھاس کی ایک اور قسم کا تعارف کروایا۔ بچوں کو لگا کہ شاید امریکن گھاس لے لینی چاہیے لیکن نصیر صاحب نے بتایا کہ اس کی قیمت تھوڑی زیادہ ہے۔ امریکن گھاس کی بجائے انھوں نے فائن ڈھاکہ گھاس کی تجویز دی۔ بقول ان کے، گھاس کی یہ قسم تیزی سے اُگتی ہے اور ایسے علاقوں کے لیے موزوں ہوتی ہے جہاں سورج کی روشنی وافر اور گرمی کا موسم طویل ہو۔ سردیوں میں البتہ یہ پیلی پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ کھاد کے مناسب اور بروقت استعمال سے اس مسئلہ پر بھی کسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ نصیر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس گھاس کو پانی کی ضرورت بھی دوسری اقسام کی نسبت کم ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی قیمت بھی مناسب تھی۔ سب نے گھر کے لیے اسی کو پسند کیا۔

گھاس لگانے کا مرحلہ آیا تو پھر دو تجاویز پر مشورہ کیا گیا۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ چار انچ یا اس سے زائد وقفہ سے گھاس کے پودے لگا دیے جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جڑی بوٹیوں کو نکلتے ہی آسانی سے تلف کیا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ میدان کو بھی ہموار رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ نسبتاً مہنگا پڑتا ہے، البتہ چھوٹی جگہوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس میں گھاس کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو قالین کی طرح بچھا دیا جاتا ہے۔ اِس کا فائدہ یہ ہے کہ لان فوراً ہی گھاس سے بھر جاتا ہے اور گھاس اُگنے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ نقصان البتہ یہ ہے کہ ٹکڑوں میں جوڑ ہونے کے سبب شروع میں گھاس کچھ ناہموار لگتی ہے اور بعد ازاں کچھ مٹی ڈال کر یا کٹائی کر کے برابر کرنا پڑتی ہے۔ اور پھر اِس طریقہ میں گھاس کا پہلے ہی سے گھنا ہونے کے سبب اس میں سے جڑی بوٹیاں جڑوں سے نکالنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ قُرعہ فال البتہ دوسرے طریقہ کے حق میں ہی نکلا۔

اگلے روز سے گھاس بچھانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ نہ صرف پرانی دیسی گھاس اُکھیڑی گئی بلکہ اوپر کی سطح کی تقریباً دو دو انچ مٹی بھی کُھرچ دی گئی۔ گوڈی کی گئی اور ممکنہ حد تک جڑی بوٹیوں، ان کے بیجوں اور جڑوں کو نکال باہر کیا گیا۔ کنکریاں اور پتھر بھی چُن کر نکال دیے گئے۔ زمین کو ہموار کرنے کے لیے پہلے لکڑی کی ایک چوڑی پٹی اور بعد ازاں ایک رولر استعمال کیا گیا۔ کچھ بَھل (دریائی مٹی) منگوائی گئی اور اِس میں کھاد ملا کر اس کی ایک تہہ بچھا دی گئی۔ اگلے روز نرسری سے گھاس کے بنڈل لائے گئے اور اُنھیں کھول کر گھاس کو بڑے بڑے ٹکڑوں کی شکل میں بچھا دیا گیا، اور اس پر ہلکا رولر چلایا گیا۔ آنے والے دنوں میں جہاں جوڑ پڑ رہے تھے وہاں گھاس کو ہموار رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً مٹی بھی ڈالنا پڑی۔ گھاس کے میدان کو مزید ہموار رکھنے کے لیے، عمر صاحب نے انٹرنیٹ سے دیکھ کر اس کام کے لیے ایک مخصوص اوزار بھی بنوالیا۔ جب ضرورت محسوس ہوتی تھی، کچھ مٹی ڈال کر اس اوزار کی مدد سے ہموار کر لیا کرتے تھے۔ یہ عمل کم محنت کے ساتھ حیرت انگیز نتائج دیتا تھا۔ شروع کے کچھ ایام میں، گھاس پر چلنے پھرنے سے پرہیز کیا گیا البتہ پانی کھلا دیا جاتا رہا۔ مون سون شروع ہوا تو گھاس خوب پھلی پھولی۔ ساتھ ہی ساتھ جڑی بوٹیوں اور دیسی گھاس کو نکالا جاتا رہا۔ چند ہی ہفتوں میں لان خُوش رنگ اور سرسبز گھاس سے بھر گیا۔ کٹائی ہونے کے بعد تو یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سبز رنگ کا خوش نُما قالین بچھا ہوا ہو۔ اور پھر اکیلی گھاس ہی تو نہ تھی، اور پودے بھی تو لگائے گئے تھے جو سب مل کر انتہائی دل کش منظر پیش کرتے تھے۔

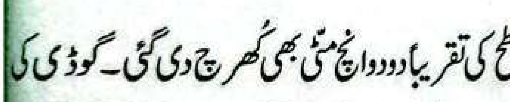

لیولر

دیسی گھاس

کورین گھاس

امریکن گھاس

فائن ڈھاکہ گھاس

مشق

سوال:

1. سبق اچھی طرح پڑھ کر گھاس کے تمام فوائد بیان کریں۔
2. پاکستان میں گھاس لگانے کے لیے عام طور پر کون سی اقسام استعمال کی جاتی ہیں؟ ایک چارٹ بنا کر ان کی خصوصیات کا موازنہ کیجیے۔
3. گھاس کی قسم کو چُنتے ہوئے کن اُمور کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے اور کیوں؟
4. گھاس لگانے کے دو عمومی طریقے بتائیے۔ اپنے گھر کے چھوٹے لان میں کس طریقہ سے گھاس لگانا پسند کریں گے؟
5. سکول کے بڑے میدانوں میں گھاس لگانے کے لیے کس طریقہ کو ترجیح دینی چاہیے اور کیوں؟

سکول کا کام

سکول میں مختلف قطعات پر، نرسری سے گھاس کی مختلف اقسام لا کر بچوں کے ساتھ مل کر لگائیں تا کہ وہ عملی طور پر ان کی خصوصیات سے بھی آگاہ ہو سکیں اور ان کو لگانے کے طریقۂ کار سے بھی۔ اگر ممکن ہو تو سبق میں دیے گئے دونوں طریقوں سے گھاس لگائیں۔

گھر کا کام

بچوں کو آمادہ کیجیے کہ اگر ان کے گھر میں زمین کا کوئی کچا قطعہ موجود ہے تو اس پر گھاس لگائیں۔ گھاس نرسری یا پہلے سے لگے ہوئے کسی گھاس کے قطعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ گھر میں کچا قطعہ موجود نہ ہونے کی صورت میں گھر کے اطراف میں مطلوبہ قطعہ تلاش کریں اور اس پر گھاس لگائیں۔ بچوں کو تجویز دیں کہ وہ اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر بھی اپنے علم کا عملی مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اس سے دوست یا عزیز کا فائدہ بھی ہو جائے گا اور اُن پر بچوں کے علم کی دھاک بھی بیٹھ جائے گی۔

لان کی تیاری (۲)

گھاس کے بعد لان میں دیگر پودے لگانے کی باری آئی تو سب گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ دیوار کی جانب اونچے درخت لگائے جائیں، درختوں کے درمیانی وقفے میں کیاریاں بنا کر پھول لگائے جائیں، ساتھ ہی دیوار پر بیلیں چڑھائی جائیں۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ لان کے اطراف میں باڑ بنائی جائے۔

الٹا اشوک

درختوں کی اقسام چُننے کا مرحلہ آیا تو عمر صاحب نے سارے گھر والوں سے مشاورت شروع کر دی۔ ان کی یہ بہت اچھی عادت تھی کہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں وہ متعلقہ لوگوں سے مشاورت کرتے تھے، سب کی رائے کو غور سے سنتے اور وزن دیتے تھے، تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے تھے اور پھر کسی فیصلہ پر پہنچتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا فیصلہ جو مشاورت سے کیا جاتا ہے اسے سب کی تائید حاصل ہوتی ہے اور اسے نافذ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے، گویا یہ کہ وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی فیصلہ بن جاتا ہے۔

عمر صاحب کی رائے تھی کہ دیوار کے ساتھ اطراف میں پھیلنے کے بجائے عمودی اُگنے والے درختوں کو ترجیح دینی چاہیے کہ ایک طرف دیوار پر بڑھتی ہوئی شاخوں کا دباؤ نہیں آتا تو دوسری طرف گھاس اور چھوٹے پودوں پر بھی سایہ نہیں پڑتا۔

'الٹا اشوک' تو سب نے کچھ گھروں میں دیکھ رکھا تھا اور پسند کرتے تھے، اس لیے اس پر تو سب کا اتفاق ہو گیا۔

پام کے درخت پر بھی اتفاق ہوا لیکن بچے یہ سن کر حیران رہ گئے کہ اس کی بے شمار اقسام ہوتی ہیں۔

عمر صاحب پہلے تو انٹرنیٹ پر ان اقسام کی تصویریں دکھاتے رہے لیکن بچوں کو تذبذب کا شکار دیکھ کر کہنے لگے، ''آؤ گاڑی میں گھومتے ہیں اور میں تمھیں گھروں اور پارکوں میں پام کے درخت دکھاتا ہوں۔''

رائل پام

بوتل پام

اریکا پام

فوکس ٹیل پام

کین پام

پونی ٹیل پام

سلور فین پام

کوئن پام

اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تو سب سے زیادہ گھروں میں رائل پام نظر آیا۔ بوتل پام، کین پام، کوئن پام، سلور فین پام، پونی ٹیل (فوارہ) پام، اریکا پام وغیرہ بھی سب دیکھے لیکن اتفاق فوکس ٹیل پام کے حق میں ہوا کہ اس کا تنا پتلا، لمبا اور خوبصورت ہوتا ہے اور اُوپری حصہ پتوں بھری شاخوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ نرسری سے پانچ سے چھ فٹ اونچے تین پام کے درخت اور تین اشوک کے درخت لے لیے گئے اور دونوں اقسام کو ملا کر چھ چھ فُٹ کے وقفہ سے لگا دیا گیا۔

بوگن بیل

گولڈن شاور بیل

جھمکا بیل

بیل چُننے کا مرحلہ نسبتاً آسان تھا۔ مختلف رنگوں کے پھولوں سے سارا سال بھری رہنے والی بوگن بیل کو تو سب ہی لگانا چاہتے تھے۔ ویسے بھی عمر صاحب کہا کرتے تھے کہ بوگن بیل پاکستان کو بڑی راس آئی ہے، سارے ملک میں ہی نظر آتی ہے۔ پانی کی ضرورت بھی کچھ خاص نہیں، بلکہ کم پانی دیں تو زیادہ پھُول دیتی ہے۔ نرسری والے صاحب نے سُرخ، گُلابی، نارنجی، جامنی، پیلے اور سفید پھُول دینے والے بوگن بیل کے پودے دکھائے۔ بچوں نے سُرخ اور جامنی رنگ کا انتخاب کیا۔

ایک اور بیل لگانے کا فیصلہ ہوا تو گولڈن شاور بیل اور جھمکا بیل میں جوڑ پڑ گیا۔ مالٹا رنگ کے پھولوں والی گولڈن شاور بیل بھی سب کو پسند آئی لیکن وہ زیادہ تر سرد یا معتدل موسم میں پھول دیتی ہے جبکہ پاکستان میں عموماً موسم گرما طویل ہوتا ہے۔ ایک طویل بحث کے بعد آخر کار جھمکا بیل کو چُن لیا گیا۔ ایک تو یہ پاکستان میں خاصی کامیاب تھی اور دوسرا پھول بھی گرمیوں میں دیتی تھی۔ ویسے بھی شاید اس کے گلابی پھول گھر والوں کو زیادہ بھا گئے تھے۔ اس کا ایک پودا دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا اور ایک گیراج کے ساتھ چڑھا دیا گیا کہ آنے والے سالوں میں گیراج کی چھت کو پوری طرح ڈھک کر بیل بہت خوبصورت لگے گی۔

ڈیورنٹا

فائیکس

باڑ کے لیے فائیکس (Ficus) اورڈیورنٹا(Duranta) کے پودوں پر غور کیا گیا۔ڈیورنٹا کے پودے گھنی باڑ بناتے ہیں، پتّے چھوٹے اور پتلے ہوتے ہیں، رنگ ہلکے سبز سے لے کر گہرے سبز تک ہوتا ہے، گرم اور خشک علاقوں میں لگائی جا سکتی ہے۔ فائیکس کے پودے بھی اچھی باڑ بناتے ہیں۔ عام طور پر اس کی دو اقسام، سبز اور سنہری کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے نچلے حصّے پر کم پتّے نکلتے ہیں اور شاخوں کا رُخ بھی اوپر کی جانب ہوتا ہے۔ فائیکس کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس میں پتّے دو رنگ کے ہوتے ہیں، اندر والا حصّہ سبز اور باہر والا سفید ہوتا ہے۔

ڈیورنٹا کو فائیکس پر اس لیے ترجیح دینے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ اوّل الذکر کی ایک گولڈن قسم کا رنگ بہت خوش نُما ہوتا ہے۔ ویسے بھی ڈیورنٹا گرمی اور دھوپ کو فائیکس سے بہتر برداشت کرتا ہے۔ نرسری سے ڈیورنٹا کے گملے لانے کے بعد عمر صاحب نے ایک قطار میں دو سے ڈھائی فٹ کے فاصلے پر نشان لگا دیے۔ بچوں کے ذمہ لگا کہ وہ گملوں کے حجم سے ذرا بڑے گڑھے کھودیں۔ عمر صاحب نے گملوں میں سے پودے نکال کر گڑھوں میں لگا دیے اور ضرورت کے مطابق مٹّی بھی ڈال دی۔ اس بات کا البتہ خیال رکھا کہ مٹّی کی سطح اطراف کی مٹّی کی سطح سے تقریباً ایک انچ نیچی ہو تاکہ پانی ٹھہر سکے۔ پودے لگانے کے بعد انھیں مناسب مقدار میں پانی بھی لگا دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر عمر صاحب پوچھنے لگے: ''باقاعدگی سے پانی لگانے کی ذمہ داری کون لے گا؟''

گُل نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

''بس اس بات کا خیال رکھیے گا کہ جڑ گیلی ہو، پانی میں ڈوب نہ جائے۔'' عمر صاحب نے اسے ہدایت دی۔

''مجھے اس کا کیسے پتا چلے گا؟'' گُل کا سوال خاصا معقول تھا۔

''پانی دیتے ہوئے آپ اتنا دھیان رکھا کریں کہ پانی دینے کے کچھ دیر بعد بس مٹّی نَم ہو، پانی کھڑا نظر نہ آئے۔ گرم موسم میں زیادہ اور سرد میں کم پانی دینا ہوگا۔ بارش کے دنوں میں بھی زیادہ پانی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' عمر صاحب نے تو پورا کُلیہ ہی بیان کر دیا۔

''یہ پانی دے گی تو مَیں کیا کروں گا؟'' خضر نے پوچھا۔

عمر صاحب خضر کی طرف مُڑے اور گویا ہوئے: ''آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ جیسے جیسے پودے بڑے ہونے لگیں، انھیں اوپر سے کاٹتے رہیے گا تاکہ وہ اطراف میں پھیل سکیں۔''

''حاضر جناب!'' خضر نے کھٹ سے سلیوٹ مار دیا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

مشق

سوال:

- دیواروں کے قریب کیسے درخت لگانے چاہییں اور کیوں؟
- بوگن بیل پاکستان میں اِس قدر مقبول کیوں ہے؟ اس کی کوئی سی تین خصوصیات بیان کیجیے۔
- باغیچے یا لان کے اطراف میں باڑ لگانے کے فوائد پر غور کیجیے اور انھیں ضبط تحریر میں لائیں۔ باڑ لگانے کے کم از کم دو نقصانات بھی بیان کریں۔
- باڑ کے پودے لگانے کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جاسکتا ہے؟
- پودوں کو پانی دیتے ہوئے عام طور پر مقدار کا تعین کیسے کیا جاسکتا ہے؟

عملی کام

سکول کا کام

قریبی نرسری سے موزوں بیلوں کے پودے لائیے اور بچوں کے ساتھ مل کر سکول میں دِیواروں اور ستونوں کے ساتھ لگائیے۔ ستونوں کے ساتھ کچّی زمین میسّر نہ ہونے کی صورت میں بڑے گملوں کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح میدانوں اور باغیچوں کے اطراف میں غیر ضروری گزرگاہوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے باڑ لگائیے۔ اس مقصد کے لیے ڈیورنٹا اور فائیکس، دونوں کے پودے استعمال کریں۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیں کہ وہ اپنے گھر میں بھی کسی موزوں بیل کا کم از کم ایک پودا لگائیں اور اُسے چھت یا دیوار پر چڑھائیں۔ کچّی زمین نہ ہونے کی صورت میں بڑے گملوں کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بیل پر پھول لگنے پر بچوں کو کچھ پھول سکول لانے اور جماعت میں دکھانے کا بھی کہا جاسکتا ہے تاکہ اس معاملہ پر پیش رفت کا جائزہ بھی لیا جاسکے اور دوسرے بچوں کی ترغیب کا بھی اہتمام ہو سکے۔ البتہ ایسا کرتے ہوئے انھیں اس بات کا بھی رس دیجیے گا کہ پھولوں کو غیر ضروری طور پر توڑنا نہیں چاہیے۔

لان کی تیاری (۳)

جب لان میں پھول لگانے کا مرحلہ آیا تو بچے بڑے پُر جوش تھے۔ عمر صاحب خود بھی پھولوں کے بارے میں بہت معلومات رکھتے تھے سو بچوں کو لے کر بیٹھ گئے کہ پھولوں کا باہمی مشاورت سے انتخاب کیا جا سکے۔

''پھولوں کا بادشاہ کس پھول کو کہتے ہیں؟'' عمر صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا۔

دونوں بچے جواب دینا چاہتے تھے لیکن عمر صاحب گُل کی طرف متوجہ ہوئے۔

''گلاب کو۔'' گُل نے جھٹ سے جواب دیا۔

''اور آپ بتائیں کہ اسے پھولوں کا بادشاہ کہتے کیوں ہیں؟'' عمر صاحب اب خضر کو مخاطب کر کے بولے۔ وہ غالباً دونوں بچوں کی عمروں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے سوال کر رہے تھے۔

''اس کی خوشبو بہت اچھی ہوتی ہے شاید اس لیے'' خضر سوچتے ہوئے بولا ''اور پھر اس کے بہت سے رنگ بھی ہوتے ہیں۔''

''چلیں یہ تو آپ نے ٹھیک بتایا ہے لیکن میں آپ کو اس کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہوں'' عمر صاحب بولے، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ گلاب کا پودا سدا بہار ہوتا ہے۔ اور دنیا بھر میں پایا جاتا ہے اور پھر جیسا خضر نے کہا یہ بہت ڈھیر سارے رنگوں میں آتا ہے، اگرچہ سرخ گلاب سب سے زیادہ مشہور اور پسند کیے جاتے ہیں، بلکہ اس کو تو محبت کا استعارہ بھی سمجھا جاتا ہے۔''

بچوں کو غور سے سنتا دیکھ کر عمر صاحب پوچھنے لگے: ''جب ہمارے گلاب تیار ہو جائیں گے تو آپ سب سے پہلا سرخ پھول کسے دیں گے؟''

گُل نے بے ساختہ عمر صاحب کی طرف جبکہ خضر نے اپنی امی کی طرف اشارہ کیا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔

ڈاکٹر شہناز کہنے لگیں: ''یہ بھی بتائیں ناں کہ ان سے عرقِ گلاب بھی حاصل کیا جاتا ہے جو عطر بنانے کے ساتھ ساتھ اور بہت سے کاموں میں لایا جاتا ہے، اس کو تو جِلد کی چھوٹی موٹی تکالیف کے لیے بھی لگایا جا سکتا ہے، بہت سی ادویات کی تیاری میں بھی اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔''

''ٹھیک کہا آپ نے، ویسے بھی گلاب کے کیا کہنے، انسانوں کا پرانا دوست ہے۔ بہت سی قدیم قصے، کہانیوں اور خاص طور پر شاعری میں اس کا بہت ذکر ملتا ہے۔ اور پھر آپ اس کی پتیوں کو ہاتھ لگا کر دیکھنا، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مخمل کی بنی ہوئی ہوں۔'' عمر صاحب نے مزید بتایا۔

گلاب

چنبیلی

'' گلاب کو کیسے لگاتے ہیں؟'' خضر جاننا چاہ رہا تھا۔

'' گلاب کو عام طور پر قلموں کے ذریعے لگایا جاتا ہے۔'' عمر صاحب نے بتلایا۔

'' قلمیں کیا ہوتی ہیں؟'' گل نے سوال کیا۔

'' قلموں سے مراد یہ ہے کہ ہم تقریباً چھ سے آٹھ انچ لمبی گلاب کی ٹہنیاں لے کر ان کے نچلے حصوں کو مٹی میں دبا دیتے ہیں، ان سے نئے گلاب کے پودے پھوٹ پڑتے ہیں۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

گلاب لگانے پر سب گھر والوں کا مکمل اتفاق تھا۔

'' اچھا اب بتائیں کہ پاکستان کا قومی پھول کون سا ہے؟'' عمر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

'' چنبیلی۔'' اس سوال کا جواب صرف خضر کو معلوم تھا۔

'' درست کہا آپ نے، چنبیلی کو موتیا بھی کہتے ہیں۔ چنبیلی بھی ایک سدا بہار پودا ہے جس پر سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے اور انتہائی خوشبودار پھول لگتے ہیں۔ یہ بیل اور پودے دونوں شکلوں میں لگایا جا سکتا ہے اور گملوں اور لٹکنے والی ٹوکریوں میں بھی۔ اگر اسے گرمیوں سے کچھ پہلے لگا لیں تو عین موسم گرما میں اسے بہت پھول لگتے ہیں۔ عام طور پر اس کو بھی قلموں کی صورت میں ہی لگایا جاتا ہے۔'' عمر صاحب نے وضاحت سے بتایا۔

'' آپ اس میں کوئی اضافہ کرنا چاہیں گی؟'' عمر صاحب اپنی بیگم کی طرف مڑے۔

'' موتیا کے پھولوں کی کھلی کھلی سفید رنگت اور اس کی بھینی بھینی خوشبو کی وجہ سے یہ عورتوں میں بہت مقبول ہیں جو انہیں بالوں میں، ہاروں میں اور گجروں میں پہنتی ہیں'' ڈاکٹر شہناز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،'' ان کے حوالے سے ایک اور مزے دار بات یہ ہے کہ ان کی ایک قسم سے بہت مزے دار سبز چائے (JasmineTea) بھی بنتی ہے۔''

'' ابو! چنبیلی کو ہمارا قومی پھول کیوں چنا گیا ہے؟'' خضر کے ذہن میں کافی دیر سے یہ سوال کلبلا رہا تھا۔

'' اس کی باقی خوبیاں تو ایک طرف لیکن چونکہ اس کے پھول سفید اور پتے سبز ہوتے ہیں اور ہمارے جھنڈے میں بھی سفید اور سبز رنگ ہیں، ہو سکتا ہے اس نسبت سے بھی اسے ہمارا قومی پھول منتخب کیا گیا ہو۔''

بچے یہ ساری گفتگو بڑی دلچسپی اور انہماک سے سن رہے تھے۔

''چنبیلی سے ایک ملتا جلتا پودا ہوتا ہے 'رات کی رانی'، اس کے پھول سبزی مائل سفید اور قدرے لمبے ہوتے ہیں، ہم اسے بھی لگائیں گے۔'' عمر صاحب نے بچوں کو بتایا۔

''اسے رات کی رانی کیوں کہتے ہیں؟'' گل پوچھنے لگی۔

''بھئی اس لیے کہ اس کے پھول رات کو کھلتے اور خوشبو دیتے ہیں۔ یہ اس قدر خوشبو دیتے ہیں کہ ایک پودا بھی سارے گھر کے لیے کافی ہوتا ہے'' عمر صاحب نے جواب دیا، ''ویسے تو یہ پودا سدابہار شمار ہوتا ہے لیکن یہ موسمِ گرما میں زیادہ پھلتا پھولتا ہے۔ اگر اسے موسمِ بہار میں لگا لیا جائے تو گرمیوں میں خوب پھول دیتا ہے۔ اسے بھی قلم سے لگانا بہتر ہوتا ہے۔''

''اس کی ایک اور دل چسپ خصوصیت یہ ہے کہ یہ جہاں لگا ہوا ہو وہاں مچھر اور ایسے دیگر کیڑے نہیں آتے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے گرہ لگائی۔

گلاب، چنبیلی اور رات کی رانی کا فیصلہ ہو چکا تو عمر صاحب کہنے لگے: ''ہم ونکا، زینیا اور میری گولڈ بھی لگائیں گے۔''

بچے ان پھولوں سے واقف نہ تھے سو عمر صاحب نے کمپیوٹر کھول کر اُنھیں ان پھولوں کی تصویریں دکھانا شروع کر دیں۔ ''یہ وِنکا ہے، اس کے پھول نسبتاً چھوٹے اور رنگ برنگے ہوتے ہیں۔ اسے بیج سے اگانا مفید ہے۔ اگر اسے گرمیوں کے اوائل میں لگا لیا جائے تو عین گرما میں خوب پھول دیتا ہے۔ اس کے پھول عام طور پر گلابی، سُرخ، سفید اور جامنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ بہت دنوں تک کِھلے رہتے ہیں، اس لیے اِنھیں سدابہار وِنکا بھی کہتے ہیں۔ ان پر تتلیاں بھی خوب آتی ہیں۔''

بچے تتلیوں کے ذکر پر مچل اٹھے۔ ان کی دلچسپی دیکھتے ہوئے عمر صاحب نے پھولوں کی ایک اور قسم کی تصویریں نکال لیں'' یہ زینیا کے پودے ہیں۔ اس کے پھول نسبتاً بڑے اور عام طور پر گولائی مائل ہوتے ہیں۔ انتہائی خوش نما اور روشن رنگوں میں آتے ہیں۔ زینیا کے پودے تیزی سے اُگتے ہیں اور بہت پھول دیتے ہیں۔ اس خصوصیت کی بنا پر تھوڑے ہی عرصے میں یہ آپ کے لان کو رنگوں سے بھر دیتے ہیں۔ تتلیاں ان کی طرف تو کھنچی چلی آتی ہیں۔''

''ابو! اب تتلیاں اس قدر کم کیوں نظر آتی ہیں؟'' گل نے سوال پوچھا۔

''بیٹا جیسے جیسے انسانی آبادیاں بڑھ رہی ہیں، درخت اور جنگل کٹ رہے ہیں جس سے تتلیوں کے مُسکن ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلی اور آلودگی بھی ان کی افزائشِ نسل کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ رہی سہی کسر کیڑے مار ادویات کے بے دریغ استعمال نے پوری کر دی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمیں تتلیاں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

ابھی بچے تتلیوں کے غم سے ہی نہ نکل پائے تھے کہ عمر صاحب نے جگنوؤں کا ذکر شروع کر دیا۔ ''جب ہم بچے تھے تو رات کی تاریکی میں اپنے صحن میں اور اطراف کے کھیتوں میں ہر طرف جگنوؤں کی ٹمٹماتی ہوئی ننھی منی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ بچے ان کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کو اپنی

مٹھیوں میں بند کر کے ان کی روشنی سے محظوظ ہوتے تھے۔ ہماری درسی کتابوں میں اُن دنوں علامہ اقبال کی مشہور نظم "بلبل اور جگنو" بھی ضرور شامل کی جاتی تھی، وُہی جس کے دو شعر بہت مشہور ہیں:

؎ حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

اور پھر

؎ ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اس نظم میں جگنو اندھیرے میں بلبل کو اس کے گھر کا راستہ دکھلاتا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ جو جگنو کبھی بلبل کو راستہ دکھایا کرتا تھا، اس کا اپنا راستہ ہی کھو گیا ہے اور وہ آج کہیں نظر نہیں آتا۔" عمر صاحب کے لہجے میں تاسف نمایاں تھا۔

بچے باقاعدہ غمگین ہو گئے تھے۔ ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر عمر صاحب نے ان کا حوصلہ بڑھایا، "ارے بھئی ہم خوب پودے اور درخت

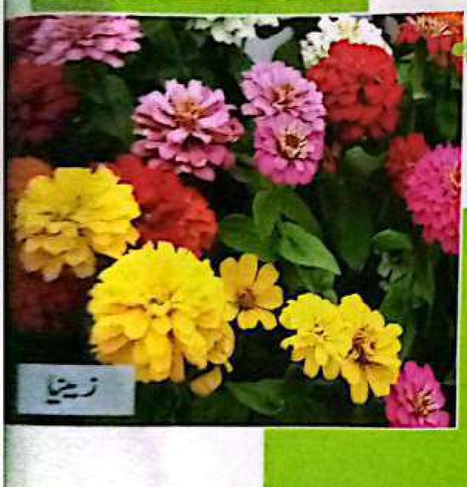
زینیا

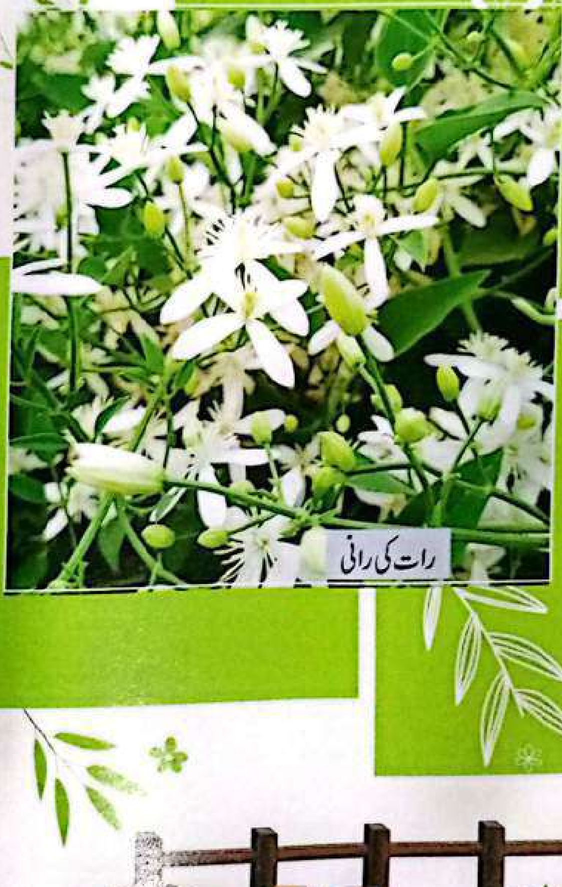
رات کی رانی

وِنکا

لگائیں گے، آلودگی بھی کم کریں گے، دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں گے اور تتلیوں، جگنوؤں اور شہد کی مکھیوں کو اپنے کھیتوں میں، اپنے باغوں میں، اپنے لانوں میں واپس لائیں گے۔''

بچوں کی آنکھوں میں اُمید کے چراغ پھر سے جل اٹھے اور وہ نئے جذبے سے پھولوں کے چناؤ میں لگ گئے۔

''اور یہ ہامیری گولڈ جسے گیندا بھی کہتے ہیں، میرا پسندیدہ پھول، اس کے پھول بھی بڑے اور گولائی مائل ہوتے ہیں اور زرد، نارنجی، سرخ اور سنہرے رنگوں میں آتے ہیں۔ بہار سے لے کر موسمِ گرما کے اوائل تک اس کے بیجوں کو گملوں میں لگایا جا سکتا ہے، تین سے چار ہفتوں میں جب پنیری تیار ہو جائے تو پودوں کو ان کی مطلوبہ جگہ پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ تقریباً آٹھ ہفتوں میں اس کے پودوں پر پھول لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔'' عمر صاحب نے تفصیل سے بتایا۔

''ہم گملوں میں گُلِ دوپہری بھی لگا لیتے ہیں۔ بغیر تنے کے چھوٹا سا پودا ہوتا ہے، اس کی ٹہنی توڑ کر اس کے سرے کو کہیں بھی مٹی میں دبا دیں تو نیا پودا اُگنا شروع کر دیتا ہے۔ گلابی، جامنی، نارنجی اور پیلے پھول لگتے ہیں اس پر۔'' ڈاکٹر صاحبہ بچوں سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''اسے گُلِ دوپہری کیوں کہتے ہیں؟'' خضر نے سوال کیا۔

ڈاکٹر صاحبہ مسکرانے لگ گئیں: ''مجھے پتا تھا تم لوگ یہ سوال ضرور پوچھو گے۔ اسے گُلِ دوپہری اس لیے کہا جاتا ہے کہ گرمیوں کے دنوں میں صبح کو یہ کھلتے ہیں، ساری دوپہر کھلے رہتے ہیں اور شام سے پہلے بند ہو جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحبہ پھر عمر صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں اور کہنے لگیں: ''آج پھولوں کا ذکر چلا ہے تو آپ بچوں کو دیگر موسموں کے مشہور پھولوں کے بارے میں بھی تھوڑا تھوڑا بتا کیوں نہیں دیتے؟''

''بات تو ٹھیک ہے، چلو بچو! آپ کو کچھ اور پھولوں کے بارے میں بھی بتاتے ہیں'' عمر صاحب نے پھر سے اپنا کمپیوٹر کھول لیا، ''یہ گُلِ داؤدی ہے۔ اپنے منفرد رنگوں اور اشکال کی وجہ سے دنیا کے مقبول ترین پھولوں میں سے ایک ہے۔ گُلِ داؤدی گلاب کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا تراشیدہ پھول (کٹ فلاور) ہے کیونکہ اس کے پھولوں کے تر و تازہ رہنے کا دورانیہ کئی دنوں پر محیط ہوتا ہے۔ یہ گرمیوں کے اواخر اور خزاں میں خاصے پھول دیتا ہے۔''

''ابو یہ تو وہی پھول ہے ناں جسے اکثر لوگوں نے چھڑی کے ساتھ باندھ رکھا ہوتا ہے؟'' خضر نے سوال کیا۔

''درست کہا آپ نے، اکثر لوگ اس کے پودے کو سہارا دینے کے لیے اسے سرکنڈے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔''

''یہ گُلِ نرگس ہے'' عمر صاحب نے بچوں کو اگلے پھول کے بارے میں بتانا شروع کیا، ''اس کے پھول زیادہ تر پیلے اور سفید ہوتے ہیں۔ انہیں اگر موسمِ سرما کے اوائل میں لگا لیا جائے تو بہار کے موسم میں خوب پھول دیتے ہیں۔''

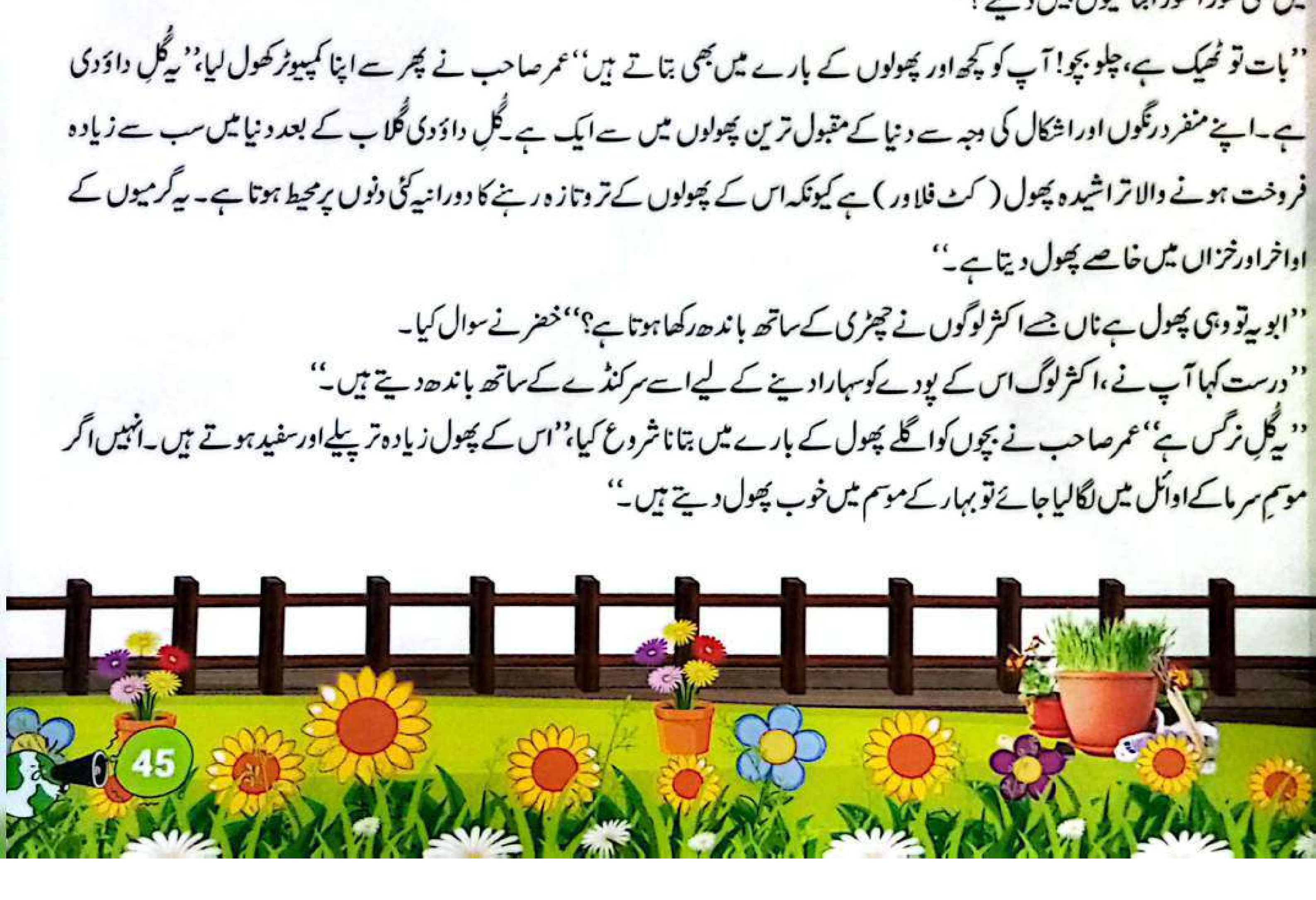

''اس کے پھولوں کی شکل کس سے ملتی ہے؟'' عمر صاحب نے گُل کو ایک پھول کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''ابو، یہ تتلی جیسے لگتے ہیں۔'' گُل نے کمپیوٹر کی سکرین پر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''درست کہا تم نے'' عمر صاحب بولے، ''یہ تتلی نما پھول پینزی ہے۔ اسے زیادہ تر جامنی اور پیلے رنگوں میں دیکھا جاتا ہے۔ اسے بیجوں اور قلم دونوں کے ذریعے کاشت کیا جا سکتا ہے۔ اگر سردیوں سے ذرا پہلے لگا دیں تو ساری سردیوں میں پھول دیتا رہتا ہے۔''

''اور یہ سردیوں کا ایک پھول ہے پٹونیا'' عمر صاحب نے ایک اور پھول کے بارے میں معلومات دینا شروع کیں، ''اس کے پھول دیکھنے میں نازک ہوتے ہیں اور بہت سے رنگوں میں آتے ہیں۔ اسے کم از کم پانچ چھ گھنٹے کی روشنی درکار ہوتی ہے، سردیوں کے اوائل میں تو پھول دیتا ہے لیکن سخت سردی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اب بس کریں، پھولوں کی بہت باتیں ہوگئیں۔ ویسے بھی اب ہمارے اپنے پھول جیسے بچوں کے دودھ پینے کا وقت ہوگیا ہے۔'' ڈاکٹر شہناز نے مسکراتے ہوئے محفل کے خاتمے کا اعلان کیا۔

مشق

سوال:

1. پھولوں کے فوائد گنوائیے۔ آپ کے نزدیک پھولوں کا سب سے اہم فائدہ کون سا ہے؟
2. گلاب کے پھول کے خواص اور استعمال بتائیے۔ اسے پھولوں کا بادشاہ کیوں کہا جاتا ہے؟
3. پاکستان کا قومی پھول کون سا ہے؟ اس کے کوئی سے تین استعمال بتائیے۔
4. 'رات کی رانی' کو یہ نام کیوں دیا گیا ہے؟
5. تتلیاں اور جگنو کیوں معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں؟ انھیں بچانے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہییں؟

سکول کا کام

موسم کے مطابق قریبی نرسری سے انواع واقسام کے پھولوں کے بیج یا پنیری لا کر سکول میں کیاریوں اور گملوں میں بچوں کے ساتھ مل کر لگائیں۔ اس سرگرمی کو ہر موسم میں دہرائیں۔ ہو سکے تو بچوں کو بھی اکٹھے یا چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں نرسریوں، پارکوں اور باغیچوں میں لے کر جائیں اور پھولوں کی مختلف اقسام سے متعارف کروائیں۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیجیے کہ وہ اپنے گھر پر بھی پھول اُگائیں۔ زمین نہ ہونے کی صورت میں انھیں پھول گملوں میں لگانے کا کہیے۔ اس حوالہ سے ان سے باقاعدگی سے پوچھ پڑتال کرتے رہیے۔ اگر ہو سکے تو کوئی ایک دن مقرر کر کے بچوں کو اپنے گھر پر تیار شدہ ایک ایک گملا لانے کا کہیے۔ اس موقع پر بچوں کی کاوشوں کی تعریف اور حوصلہ افزائی کیجیے۔ پھول اُگانے کے دوران بچوں کو پیش آنے والی مشکلات پر بھی مکالمہ کیجیے اور ان کے حل تجویز کریں۔ اس سرگرمی میں مزید بہتری لانے کے لیے سکول کے مالیوں یا قریبی نرسری سے کسی ماہر کو بھی اس مکالمہ میں شریک کیا جا سکتا ہے۔

کچن گارڈننگ

خضر اور گُل کی امی اس بات پر بہت نالاں رہتی تھیں کہ دن بدن مہنگائی ہونے کے سبب سبزیوں کی قیمتیں بھی بڑھتی چلی جا رہی تھیں جس سے ا کے گھر کا بجٹ بھی اچھا خاصا متاثر ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے سبب وہ اس بات پر بھی بہت پریشانی کا اظہار کرتی رہتی تھیں کہ سبزیوں کی کاش میں آلودہ پانی، کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویات کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے جو انسانی صحت کے لیے بہت خطرناک تھا۔ ایک روز خضر ا سکول سے کچن گارڈننگ اور اس کے فوائد کی بابت سن کر آیا تو رات کو کھانے کی میز پر گھر والوں کے ساتھ اس کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔ سب گھر والے بڑ دلچسپی سے سن رہے تھے لیکن امی تاسف کے ساتھ کہنے لگیں کہ گھر میں تو اتنی جگہ ہی نہیں کہ کچن گارڈننگ کی جا سکے۔ اس پر خضر بتانے لگا کہ اس ک ٹیچر کہہ رہے تھے کچن گارڈننگ کے لیے تو اوسطاً ایک گھرانہ کی سبزیوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے محض تین مرلہ جگہ درکار ہوتی ہے۔ ا سے بھی اہم بات یہ تھی کہ اگر گھر میں زمین موجود نہ بھی ہو تو سبزیوں کو مٹی کے گملوں، پلاسٹک کے ٹب، ٹوکریوں، لکڑی کے کریٹ، شاپر بیگ لوہے کے ڈرم، پرانے ٹائر وغیرہ میں کاشت کیا جا سکتا ہے۔

''یہ مرلہ کیا ہوتا ہے؟'' گُل نے پوچھا۔

''مرلہ ہمارے ملک میں زمین کی پیمائش کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والی اکائی ہے۔ یہ لگ بھگ 272 مربع فٹ جگہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ 17 فٹ لمبی اور 16 فٹ چوڑی جگہ تقریباً ایک مرلہ ہوتی ہے۔'' عمر صاحب نے بچوں کو سمجھایا۔

''کچن گارڈننگ کی ضرورت کیا ہے؟'' گُل اس کی افادیت سمجھنا چاہ رہی تھی۔

''کچن میں استعمال ہونے والی سبزیاں گھروں میں کاشت کرنے کا سب سے بڑا مقصد آلودگی سے پاک، تازہ اور صاف سبزیوں کا حصول ہے۔ اس سے نہ صرف گھر کے بجٹ میں بچت ہو جاتی ہے بلکہ میڈیکل بل میں بھی کمی آ جاتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ماحول میں تازگی ک احساس پیدا کرتی ہیں۔'' ڈاکٹر شہناز نے وضاحت کی۔

کھانے کی میز پر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس معاملہ میں محکمہ زراعت میں کام کرنے والے عمر صاحب کے ایک دوست عرفان وحید سے بھی مدد اور رہنمائی لی جائے گی۔ ان سے بات کی گئی تو وہ وعدے کے مطابق اتوار صبح دس بجے ان کے گھر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے موزوں جگہ کی تلاش کی گئی۔ عرفان صاحب کا کہنا تھا کہ سبزیوں کو ایسی جگہ کاشت کرنا چاہیے جہاں ان پر کم از کم چھ سے آٹھ گھنٹے براہ راست دھوپ پڑے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں ہوا کا گزر با آسانی ہو۔ دیواروں کے قریب ہوا کا عمل دخل کم ہو جاتا ہے، اس لیے اگر ممکن ہو تو سبزیات کو دیوار سے پانچ چھ فٹ ہٹا کر کاشت کرنا چاہیے۔ اور اگر سبزیاں کنٹینرز میں کاشت کرنی ہوں تو فالتو پانی کے نکاس کے لیے ان میں سوراخ رکھنے ضروری ہیں۔

عرفان صاحب پوچھنے لگے سبزیوں کا کون خیال رکھے گا۔ خضرا اور گُل دونوں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ عرفان صاحب مسکراتے ہوئے بولے:
''زراعت کے بارے میں ایک مثل مشہور ہے کہ 'کھیتی خسماں سیتی' یعنی فصل کی بہترین پیداوار تب حاصل ہوتی ہے جب اُس کو محنت کے ساتھ سینچنے والا بھی موجود ہو۔ لہٰذا اگر ہم سبزیات کا روزانہ مشاہدہ کریں گے تو علم ہو جائے گا کہ کب پودوں کو پانی، خوراک، کیڑوں یا بیماریوں کی تلفی وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ان مسائل کے بروقت حل سے بہترین نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔''

خضرا اور گُل کی ذمہ داری قرار پائی کہ وہ روزانہ کچھ دیر کے لیے پودوں کا بغور مشاہدہ کیا کریں گے۔

''لیکن چچا ہم پودوں کو کیڑوں اور بیماریوں سے کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں؟'' گُل پوچھنے لگی۔

''زمین میں بیجائی سے پہلے گوڈی کر کے اچھی طرح دھوپ لگائیں تاکہ روشنی اور حدت سے مٹی میں موجود کیڑوں کے انڈے اور بیماریوں کے اثرات ختم ہو جائیں۔ اور پھر پودوں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھیں۔ ایسا کرنے سے ان میں ہوا اور دھوپ کی آمدورفت رہتی ہے جس سے کیڑے کم لگتے ہیں۔ کچن گارڈن کو کیڑوں اور بیماریوں سے مزید محفوظ رکھنے کے لیے اس کو صاف ستھرا رکھیں، اس کے آس پاس موجود گھاس اور جڑی بوٹیوں کو تلف کرتے رہیں، اس کا باقاعدگی سے معائنہ کریں، اگر کسی کیڑے کے انڈے یا سنڈی وغیرہ نظر آئیں تو تلف کر دیں۔'' عرفان صاحب نے خاصی وضاحت سے بیان کیا۔

''تو کیا ہم کیڑے مار دوا نہیں استعمال کر سکتے؟'' گُل نے اگلا سوال پوچھا۔

''بازار سے ملنے والی کیڑے مار ادویات کے فوائد کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی ہیں۔ ان کے بے دریغ استعمال کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ مضر کیڑوں میں مدافعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ پہلے سے بھی بڑھ کر سخت جان بن جاتے ہیں اور پھر زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ ادویات مضر کیڑوں

کے ساتھ ساتھ حیات کی دوسری اقسام کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں، مثلاً فائدہ بخش کیڑے مکوڑے، ان پر پلنے والے پرندے، ان پرندوں کو کھانے والے جانور سب ہی کیڑے مار ادویات سے بری طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کی تیزی سے گھٹتی ہوئی تعداد کے پیچھے کیڑے مار ادویات کا استعمال بھی ہے۔ یہ ادویات زمینی اور آبی آلودگی کا باعث بھی بنتی ہیں۔ ان کے زہریلے اثرات خوراک میں بھی سرایت کر جاتے ہیں جس سے ہماری صحتوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ گویا وقتی فائدے کی خاطر کیڑے مار ادویات کے استعمال سے ہم اپنا دیرپا نقصان کر لیتے ہیں۔" عرفان صاحب نے ان ادویات کے کئی نقصانات گنوا دیے۔

"تو پھر ہم کیڑوں کو مارنے یا بھگانے کے لیے کیا استعمال کریں؟" گُل کا سوال برمحل تھا۔

"اس مقصد کے لیے ہم گھر پر قدرتی کیڑے مار ادویات بنا سکتے ہیں۔ چولہے کی راکھ کا چھڑکاؤ کرنے سے کیڑے دور ہو جاتے ہیں۔ نیم کے بیجوں اور پتوں اور تمباکو کے پتوں کے رس سے بھی کیڑوں کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ مرچ، لہسن، پیاز، صابن ملا پانی، ان سب کی مدد سے بھی ہم کیڑے مار ادویات تیار کر سکتے ہیں، اور پھر بوقت ضرورت پودوں پر سپرے کر سکتے ہیں۔" عرفان صاحب نے اس مسئلہ کا حل بھی بتا دیا۔

آب پاشی کی بات آئی تو عرفان صاحب نے بتایا کہ غیر موزوں پانی دینا، پانی کم یا زیادہ دینا، پانی بروقت نہ دینا جیسے عمل پودوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ پانی کی مقدار کا انحصار بنیادی طور پر موسم پر ہوتا ہے۔ گرمیوں میں زیادہ اور سردیوں میں پودوں کی پانی کی ضرورت کم ہو جاتی ہے۔ بارشوں کے موسم میں بھی پانی دینے کی ضرورت گھٹ جاتی ہے۔ پودوں کا بغور مشاہدہ کرتے رہنے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پانی کی مقدار بڑھانی یا گھٹانی ہے۔ عمومی کلیہ یہ ہے کہ پانی دینے کے کچھ دیر بعد مٹی محض نم ہو، اس میں پانی کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔

خضر اور گُل کے گھر کے عقبی حصہ میں تقریباً دو مرلہ جگہ کو سبزیوں کی کاشت کے لیے موزوں پایا گیا۔ زمین کی تیاری کا مرحلہ شروع ہوا تو عرفان صاحب بتانے لگے کہ سبزیوں کی کاشت کے لیے زمین کا بالائی حصہ بہت اہم ہے کیونکہ اس سے پودے نے خوراک اور پانی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو بہت اچھے طریقے سے تیار کیا جائے اور اس کی زرخیزی کو بحال رکھا جائے۔ اچھی تیاری کے لیے زمین کو تقریباً ایک فٹ گہرائی تک بار بار کھودیں، زمین میں موجود کنکر، پتھر اور پلاسٹک وغیرہ کو باہر نکال دیں، مٹی کو بالکل بھربھرا اور نرم کر لیں تاکہ پودوں کی جڑوں کی اچھی طرح سے نشوونما ہو سکے اور پودے زمین سے وافر مقدار میں خوراک اور پانی حاصل کر سکیں۔

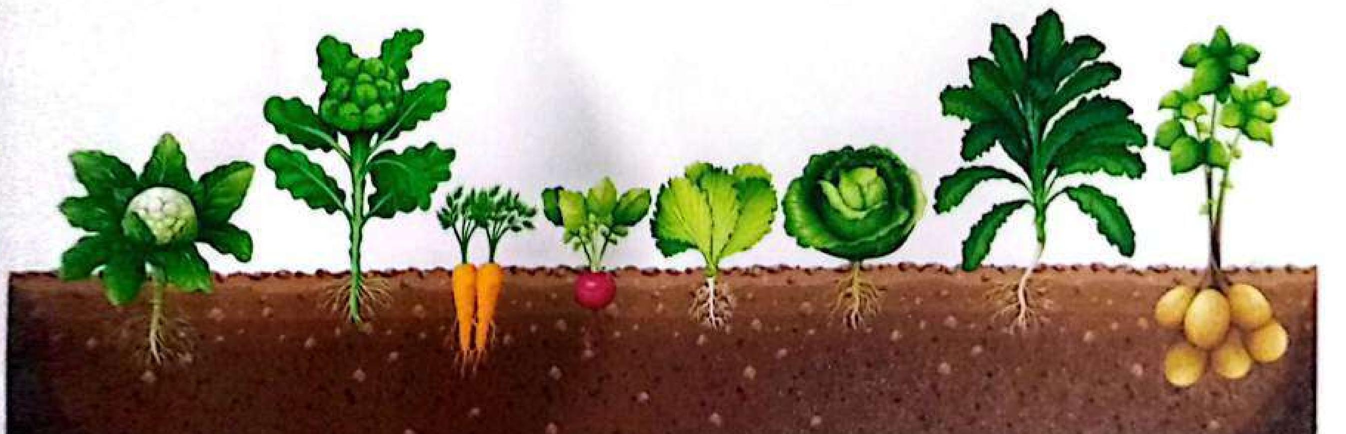

عرفان صاحب نے یہ بھی بتایا کہ کچھ سبزیوں کو براہ راست بیجوں سے کاشت کیا جاتا ہے جبکہ بعض سبزیوں کو بذریعہ پنیری کاشت کیا جاتا ہے۔ براہ راست بیج سے کاشت ہونے والی سردیوں کی سبزیوں میں مولی، شلجم، گاجر، پالک، میتھی، مٹر اور دھنیا جبکہ گرمیوں کی سبزیوں میں کریلا، کدو، تر، کھیرا، ٹینڈا، گھیا توری اور بھنڈی شامل ہیں۔ ٹماٹر، پیاز، پھول گوبھی، بروکلی، اور سلاد سردیوں میں جبکہ مرچ، شملہ مرچ اور بینگن موسم گرما میں بذریعہ پنیری کاشت ہوتی ہیں۔

''آپ جانتے ہیں پنیری کے ذریعہ کاشت کرنے سے کیا مراد ہے؟'' عرفان صاحب نے بچوں سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اس سے مراد یہ ہے کہ آپ بیجوں کو گملوں میں لگاتے ہیں، اور جب کچھ دنوں میں ان سے چھوٹے چھوٹے پودے اُگ آتے ہیں تو آپ انہیں زمین میں منتقل کر دیتے ہیں۔'' خضر نے اندازہ لگایا۔

''ارے! آپ لوگ تو بہت سمجھدار ہیں۔'' عرفان صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''چچا! ہم پودوں کی جلد بڑھوتری کے لیے کھاد ڈال سکتے ہیں؟'' خضر نے پوچھا۔

''آپ ایک بات ذہن میں رکھیں، نئی تحقیق کے پیش نظر، ہم بھی اپنے کچن گارڈن کے لئے نامیاتی کاشتکاری (Organic Farming) کے اصول اپنائیں گے، یعنی جہاں تک ممکن ہوا کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویات سے پرہیز کریں گے۔ پودوں کی بڑھوتری کے لیے بھی ہم کیمیائی کھاد پر دیسی کھاد کو ترجیح دیں گے۔'' عرفان صاحب نے جواب دیا۔

''وہ کہاں سے ملے گی؟'' خضر نے دوسرا سوال داغا۔

''دیسی کھاد گھر پر ہی تیار کی جا سکتی ہے۔ اسے تیار کرنے کے لیے بچی کھچی خوراک، سبزیوں اور پھلوں کے پتوں اور چھلکوں، انڈوں کے چھلکوں، جانوروں اور مرغیوں کے فضلے وغیرہ کو ایک درمیانے سائز کے گڑھے میں ڈال دیں، اور پھر گڑھے کو مٹی کی موٹی تہہ سے بند کر دیں۔ تقریباً دو سے تین ماہ میں یہ کھاد تیار ہو جائے گی۔ زمین کی زرخیزی کو وافر مقدار میں دیسی کھاد ڈالنے سے بڑھایا جا سکتا ہے۔'' عرفان صاحب نے تفصیل سے بتایا۔

زمین کی صفائی اور تیاری کے بعد بیج ڈالنے کا مرحلہ آیا۔ موسم گرما کے اعتبار سے کریلا، ٹینڈا، بھنڈی اور بینگن کاشت کیے گئے۔ اس کام سے فارغ ہوئے تو عرفان صاحب کہنے لگے: ''میرا مشورہ ہوگا کہ آپ کے پاس زمین کچھ کم ہے، اگر آپ گملوں میں بھی سبزیاں کاشت کر لیں تو پھر آپ کو بازار کا رُخ ہی نہیں کرنا پڑے گا۔''

''اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' خضر بول اٹھا۔

''سب سے پہلے تو آپ کو گملوں میں ڈالنے کے لیے ایک خاص قسم کی مٹی یعنی کمپوسٹ تیار کرنا ہوگی۔'' عرفان صاحب نے بتایا۔

''یہ کمپوسٹ کیسے تیار کرنی ہے؟'' اس دفعہ تو عمر صاحب کو بھی سوال پوچھنا پڑ گیا۔

''یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو ایک بڑے کنٹینر یا گملے کا انتظام کر لیں یا ایک درمیانے سائز کا گڑھا کھود لیں۔ اس میں اب دو طرح کا مواد ڈالنا ہوگا، ایک کو سبز مواد کہہ لیجیے، ایک کو براؤن یا خاکی۔ سبز مواد میں فالتو بچ جانے والی سبزیاں اور پھل، ان کے چھلکے اور گٹھلیاں، تازہ کٹی ہوئی گھاس، چائے کی پتی وغیرہ شامل ہیں۔ انڈے کے چھلکے بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ البتہ گوشت، تیل یا کسی دوسری چکنائی میں پکی ہوئی خوراک، دودھ، دہی، پنیر سے

احتراز کرنا ہوگا۔ اور براؤن مواد میں سوکھے ہوئے پتے، ٹہنیاں، لکڑی کا برادہ، خاکی لفافے، اخباریں اور کاغذ وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کنٹینر یا گڑھے م
ان اشیا کو تہہ در تہہ بچھالیں، یعنی پہلی اگر ایک رنگ کے مواد کی تہہ ہے تو دوسری دوسرے رنگ کی، تیسری تہہ پھر پہلے رنگ کی، چوتھی پھر دوسرے رنگ کی۔
ہر تہہ تقریباً ایک سے دو انچ موٹی ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ سب سے اوپر والی تہہ براؤن مواد کی ہو تا کہ بد بو اور مکھیوں سے بچا جا سکے۔ اس ڈھیر کو پانی کی مدد سے
بھی رکھنا ہوگا۔ موسم گرم ہو تو دو ماہ میں کمپوسٹ تیار ہو جاتی ہے، سرد ہو تو چھ ماہ بھی لگ سکتے ہیں۔'' عرفان صاحب نے وضاحت سے بتایا۔

'' چچا! کیا گملوں میں کمپوسٹ ڈالنا ضروری ہے، ہم عام مٹی استعمال نہیں کر سکتے؟'' گل پوچھنے لگی۔

'' نہیں، ضروری تو نہیں، بہتر ہے۔'' عرفان صاحب نے جواب دیا۔

'' چچا! دیسی کھاد اور کمپوسٹ میں کیا فرق ہے؟'' خضر تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔

'' بہت اچھا سوال ہے'' عرفان صاحب بھی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے،'' ان میں مماثلت تو ضرور ہے لیکن آپ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیجیے کہ کھا
پودوں کی خوراک ہے اور کمپوسٹ مٹی کی۔ البتہ دونوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اچھی پیداوار ملتی ہے۔''

بچوں، بلکہ بچوں کے ابا نے بھی، عرفان صاحب کے ساتھ ایک بھرپور دن گزارا تھا اور بہت سی نئی اور مفید باتیں سیکھی تھیں۔ اب وہ آنے والے دنوں میں اپنا کچن
گارڈن بنانے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

کمپوسٹ کے اجزاءِ ترکیبی

خاکی مواد

سبز مواد

مندرجہ ذیل اشیاء سے اجتناب کیجیے

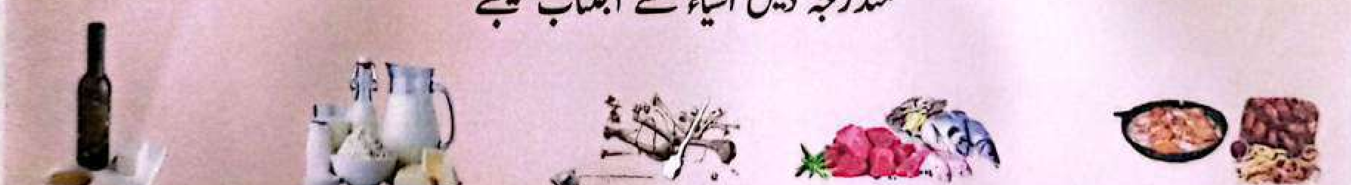

موسم سرما کی سبزیاں

وقت کاشت: ستمبر، اکتوبر
وقت برداشت: دسمبر تا مارچ

وقت کاشت: جولائی تا اکتوبر
وقت برداشت: نومبر تا فروری

وقت کاشت: اکتوبر
وقت برداشت: دسمبر تا مارچ

وقت کاشت: ستمبر، اکتوبر
وقت برداشت: نومبر تا مئی

وقت کاشت: اکتوبر، نومبر
وقت برداشت: جنوری، فروری

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: اپریل تا جون

وقت کاشت: اکتوبر
وقت برداشت: اپریل

وقت کاشت: ستمبر، اکتوبر
وقت برداشت: نومبر تا فروری

وقت کاشت: ستمبر تا نومبر
وقت برداشت: اکتوبر تا فروری

وقت کاشت: اگست، ستمبر
وقت برداشت: دسمبر، جنوری

وقت کاشت: جون تا نومبر
وقت برداشت: دسمبر تا مئی

وقت کاشت: ستمبر، اکتوبر
وقت برداشت: نومبر تا فروری

موسم گرما کی سبزیاں

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: مئی تا ستمبر

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: مئی تا ستمبر

وقت کاشت: اکتوبر، نومبر
وقت برداشت: مئی تا جولائی

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: اپریل تا ستمبر

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: اپریل، مئی

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: اپریل تا جون

وقت کاشت: مارچ، اپریل
وقت برداشت: اپریل تا جون

وقت کاشت: فروری
وقت برداشت: اپریل، مئی

وقت کاشت: مارچ
وقت برداشت: جولائی، اگست

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: اپریل، مئی

وقت کاشت: فروری تا مارچ
وقت برداشت: جون، جولائی

وقت کاشت: فروری، مارچ
وقت برداشت: مئی، جون

ہدایات

1- سبزیوں کی بروقت کاشت اچھی پیداوار کی ضامن ہے۔

2- چھوٹے پلاٹوں میں ایسی سبزیاں کاشت کریں جو زیادہ دیر تک پیداوار دیتی ہیں مثلاً پالک، میتھی وغیرہ۔

3- سبزیاں کھیلیوں پر کاشت کریں۔ کھیلیوں سے مراد کیاریوں کا ابھرا ہوا حصہ ہوتا ہے۔ ہموار سطح پر کاشت کردہ سبزیات پر بیماریاں زیادہ حملہ آور ہوتی ہیں۔

4- موسمِ گرما کی بیلوں والی سبزیات کو بانسوں اور جال/نیٹ کی مدد سے اُوپر چڑھایا جائے تاکہ پودوں میں سے ہوا کا گزر ہو سکے۔ پودوں کو بالکل دیوار کے ساتھ چپکا کر نہ چڑھائیں۔

5- سبزیوں کی دیرپا فراہمی کے لیے بہتر ہے کہ ان کی بیجائی وقفے وقفے سے کریں تاکہ ان کی فراہمی کا تسلسل دیر تک جاری رہ سکے۔ مثلاً مولی کو اگر ایک ہی وقت میں کاشت کر دیا جائے تو اُن کی فراہمی یا برداشت بھی تقریباً ایک ہی وقت پر ہو جائے گی اور یوں ان کا استعمال چند دنوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اگر اس کے بجائے دس دن کے وقفہ سے دو یا تین دفعہ بیجائی کریں گے تو ان کی فراہمی تقریباً ایک ماہ تک جاری رہے گی۔ یہی اصول باقی سبزیوں کے حوالہ سے بھی ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

مشق

سوال:

1. کچن گارڈننگ کے کم از کم پانچ فوائد تحریر کریں۔
2. 'کھیتی خصماں سیتی' اس کہاوت کا کیا مفہوم ہے؟
3. کیڑے مار ادویات کے بے جا استعمال کے نقصانات سے آگاہ کریں۔
4. سبزیاں لگانے کے لیے زمین کو کس طرح تیار کیا جانا چاہیے؟
5. دیسی کھاد کس طرح سے تیار کی جا سکتی ہے؟

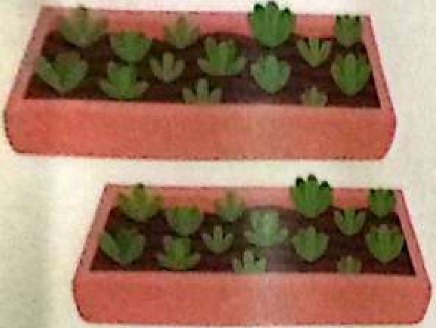

عملی کام

سکول کا کام

سکول میں ایک مناسب سائز کا قطعہ کچن گارڈننگ کے لیے مختص کر دیجیے اور باب میں دی ہوئی تمام ہدایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بچوں کے ساتھ مل کر موسمی سبزیاں کاشت کیجیے اور ان کی مکمل نگہداشت کریں۔ سبزیاں تیار ہو جانے کے بعد انہیں بچوں کی محنت کے صلہ کے طور پر ان میں تقسیم کر دیں۔ کبھی کبھار سکول کے ملازمین مثلاً مالیوں، چوکیداروں اور صفائی کرنے والے اہلکاروں میں سبزیاں تقسیم کرنا بھی بچوں میں فراخ دلی، صلہ رحمی، ایثار و قربانی جیسے اوصاف کے فروغ کا باعث بنے گا۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیجیے کہ وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر گھر پر کچن گارڈننگ کا اہتمام کریں۔ ان کو یہ بھی کہیے کہ اپنے گھر والوں کو بھی کچن گارڈننگ سے متعلق باب پڑھوائیں اور انہیں قائل کریں کہ کچن گارڈننگ ایک آسان، انتہائی مفید اور قابل عمل سرگرمی ہے۔

درون خانہ پودے

ڈاکٹر شہناز گھر کی اندرونی سجاوٹ اور آرائش کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے وہ آرائشی اشیا کے ساتھ ساتھ اکثر خاص اقسام کے ان پودوں پر بھی انحصار کرتی تھیں جو درون خانہ بھی اُگائے جا سکتے تھے۔ یہ پودے گھر کی خوبصورتی میں اضافے کا سبب بنتے اور آنکھوں کو بہت بھلے لگتے تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ ایک تحقیق کے مطابق ہم اپنی روزمرہ زندگی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ گھر کے اندر گزارتے ہیں، سو اگر گھر کے اندر ہی پودوں کی مدد سے قدرتی ماحول تخلیق کر لیا جائے تو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پودے ایک طرف تو دماغی صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں، سکون بخشتے ہیں، ذہنی دباؤ اور تناؤ کو کم کرتے ہیں، انسان کو ہشاش بشاش رکھتے ہیں تو دوسری طرف کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب اور آکسیجن خارج کر کے ہوا کو تازگی بھی بخشتے ہیں۔ وہ فلٹر کا کام بھی کرتے ہیں اور ہوا میں سے الرجی کا سبب بننے والے پھپھوندی اور دیگر مُضر ذرّات کو جذب کر کے اس کے معیار کو بہتر بنانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ذرّات ہوا میں دُھویں، صفائی کے کیمیکل، دیواروں اور فرنیچر کے پینٹ، پلاسٹک کی اشیاء اور دیگر ذرائع سے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس امر کے شواہد بھی ملے ہیں کہ کچھ پودے، کمپیوٹر، موبائل فون، وائی فائی راؤٹر اور اس نوعیت کے دیگر آلات سے خارج ہونے والی شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اس سارے عمل کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے انسان کی ذہنی و جسمانی صحت اچھی رہتی ہے اور وہ بہت حد تک کولیسٹرول، بلڈ پریشر، ذیابیطس اور دیگر ایسے عوارض سے محفوظ رہتا ہے۔

خضر اور گُل اپنے ہوش سنبھالنے کے دنوں سے ہی اپنے گھر میں درون خانہ پودے دیکھا کرتے تھے اور ان سے خاصے مانوس تھے۔ کچھ بڑے ہوئے، پودوں میں دلچسپی لینے لگے تو ان کی بابت بھی سوالات پوچھنے لگے۔ ایک روز ان کی امی کہنے لگیں: ''آؤ آج میں آپ لوگوں کو ان پودوں

اور ان کی خصوصیات سے متعارف کرواتی ہوں۔ پہلے تو یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کرلو کہ ہر پودا درون خانہ پھل پھول نہیں سکتا۔ صرف مخصوص پودے ایسے ہیں جنھیں گھر کے اندر رکھا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر پودے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انھیں براہِ راست سورج کی روشنی نہ ملے تو سوکھ جاتے ہیں۔ درون خانہ پودوں کو بھی گھر کے اندر کھڑکی کے قریب یا ایسی جگہوں پر رکھنے کو ترجیح دینی چاہیے جہاں دن میں کم از کم کچھ دیر سورج کی بلاواسطہ یا بالواسطہ روشنی ان پر پڑ سکے۔''

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایسے پودوں کو پانی کی بھی کچھ خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ بس اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مٹی سوکھ نہ جائے۔ مختلف پودوں کی پانی کی ضرورت کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس کی بابت رہنمائی ایک تو جہاں سے پودا خریدیں اُس نرسری والے سے لے لینی چاہیے، دوسرا پودے کی نشو و نما پر بھی نظر رکھ کر پانی کی ضرورت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو ڈاکٹر صاحبہ نے بچوں کو منی پلانٹ سے متعارف کروایا۔ بتایا کہ اسے بیل کی صورت میں یا گملے میں بھی کامیابی سے اُگایا جا سکتا ہے، اور یہ کہ اسے اُگانا اور سنبھالنا آسان ہے، بہت توجہ نہیں مانگتا۔ بچوں سے پوچھنے لگیں: ''کچھ اندازہ ہے اِسے منی پلانٹ کیوں کہتے ہیں؟''

خضر بولا: ''شاید اس لیے کہ تیزی سے بڑھتا ہے، نئے پتے نکالتا رہتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحبہ اَثبات میں سر ہلانے لگیں: ''درست، لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ اِس کے پتے چپٹے اور کچھ گولائی مائل بھی ہیں، سِکّوں کی طرح۔ ان کے حوالے سے یہ روایت بھی مشہور ہے کہ جس گھر میں منی پلانٹ ہوتا ہے اسے کبھی پیسوں کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔''

ڈاکٹر صاحبہ نے ڈرائنگ روم میں رکھے پام کے مختلف اقسام کے پودوں کا بھی تعارف کروایا۔ بتانے لگیں یہ بھی ایسے ہی ماحول کو پسند کرتے ہیں جیسے ہم انسان یعنی معتدل موسم، مناسب روشنی، درمیانی سی نمی۔

گولڈن پام اور بیمبو پام خاصے ہرے بھرے اور کافی حد تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے، لیکن لیڈی پام قدرے مختلف تھا۔

''اسے لیڈی پام کیوں کہتے ہیں؟'' گُل نے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحبہ مسکرانے لگیں: ''آپ غور سے اِس کے پتوں کو دیکھو، کیا ایسا نہیں لگتا جیسے کسی زنانہ ہاتھ کی مخروطی اُنگلیاں ہوں۔ بس کسی ایسی ہی وجہ

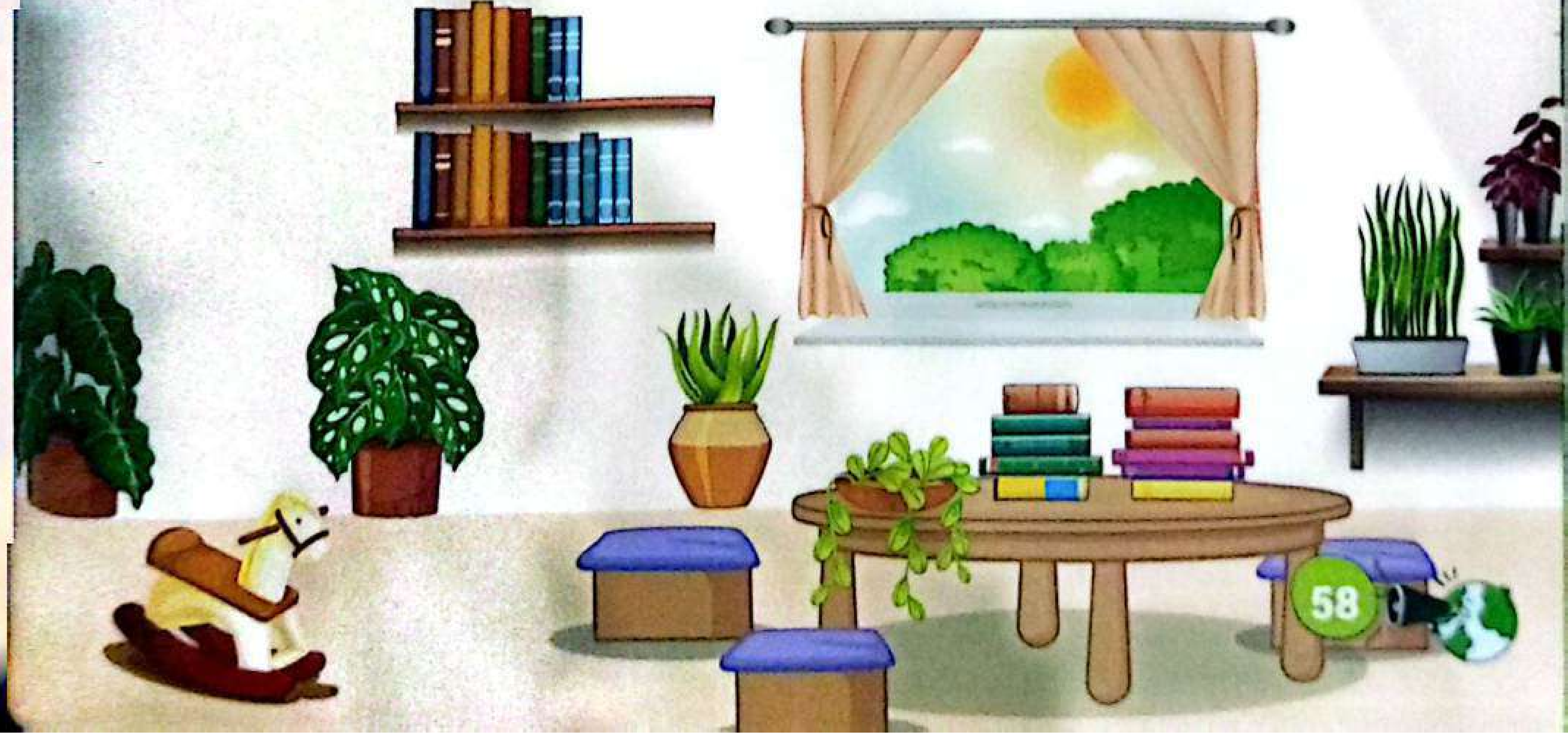

سے یہ لیڈی پام کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔''

''اور یہ پونی ٹیل پام ہے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے ایک اور پام کے پودے کا تعارف کروایا۔

''اب یہ نہ پوچھ لینا اسے پونی ٹیل پام کیوں کہتے ہیں، بھئی اس کی شکل تمہاری پونی ٹیل سے ملتی ہے۔'' خضر نے گُل کی چٹیا کھینچتے ہوئے کہا۔ گُل کسمسائی لیکن ڈاکٹر شہناز خضر کی معاملہ فہمی پر ہنس پڑیں۔

ڈاکٹر صاحبہ نے بچوں کو ڈریسینا (Dracaena) بھی دکھایا جس کے پتے پتلے اور نوکیلے تھے، تنے کا نچلا حصہ البتہ پتوں سے خالی تھا۔ انگلش آئیوی (English Ivy) اور سپائیڈر پلانٹ (Spider Plant) کو ڈاکٹر صاحبہ نے ٹوکری نما گملوں میں لٹکا رکھا تھا۔ بتانے لگیں کہ یہ پودے ہوا سے مُضر دُھویں کے اثرات کو بھی کم کرتے ہیں، اور یہ کہ جو لوگ سگریٹ نوشی جیسی بُری عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کو ایسے پودوں کو اپنے گھروں میں جگہ دینی چاہیے۔ ربر پلانٹ کے پتے جسامت کے اعتبار سے بڑے اور خاصے چمک دار تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے بقول بڑے پتوں کی وجہ سے ربر پلانٹ ہوا سے مُضر مواد کو بھی زیادہ جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ فیلوڈینڈران (Philodendron) بھی ایک خوبصورت پودا تھا اور اس کے بڑے پتے قدرتی طور پر خوبصورت ڈیزائن میں کٹے ہوئے تھے۔ فرن (Fern) کے پودوں کے بارے میں کہا کہ وہ گملوں اور لٹکانے والی ٹوکریوں دونوں میں لگائے جا سکتے تھے، اور یہ کہ وہ ہوا میں نمی بڑھاتے تھے۔

آخر میں ڈاکٹر شہناز بچوں کو ان پودوں کی طرف لے کر گئیں جو اپنی مخصوص ہیئت کی وجہ سے بچوں میں بہت تجسس بیدار کیا کرتے تھے، ''پودوں کی

گولڈن پام

پونی ٹیل پام

ڈریسینا

پام

انگلش آئیوی

فرن

منی پلانٹ

لیڈی پام

ربر پلانٹ

سپائیڈر پلانٹ

سنیک پلانٹ

کیکٹس

ایلو ویرا

فیلوڈینڈران

اس قسم کو سکولینٹ (Succulent) کہتے ہیں۔ ان کا اکثر کوئی نہ کوئی حصہ پھولا ہوا ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنے اندر پانی ذخیرہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انھیں اُگانا اور سنبھالنا انتہائی آسان اور کم خرچ ہوتا ہے۔ یہ کم پانی اور گرم موسم میں بھی پھلتے پھولتے رہتے ہیں بلکہ زیادہ پانی تو ان کے لیے زہر قاتل بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

سکولینٹ پودوں میں کانٹوں بھرے کیکٹس (Cactus) کے پودوں کو تو بچے پہچانتے ہی تھے، ڈاکٹر صاحبہ نے انھیں سنیک پلانٹ (Snake Plant) اور ایلو ویرا (Aloe Vera) سے بھی متعارف کروایا۔ سنیک پلانٹ کے پتے لمبے اور بڑے تھے اور جڑ میں سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ''یہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آکسیجن میں بدلنے کے حوالہ سے خاصے مفید ہیں، انھیں تو اپنے بیڈروم میں رکھا جانا چاہیے۔'' ڈاکٹر صاحبہ کہنے لگیں۔ ایلو ویرا کے پودے کے بارے میں بتایا کہ ویسے تو یہ پودا بالوں اور جلد کے لیے اپنے فوائد کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے لیکن ہوا کو صاف کرنے کی بھی خاصی صلاحیت رکھتا ہے۔ آخر میں ڈرائنگ روم میں رکھے سٹار فلاور (Star Flower) کی بابت بھی بات کی جسے ہر آنے والا مہمان اپنے بڑے سائز، شوخ رنگ اور عجب ہیئت کی وجہ سے مصنوعی سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ بتانے لگیں کہ یہ بھی سکولینٹ پودوں کی ہی ایک قسم ہے۔

درون خانہ پودوں کے تفصیلی تعارف کے بعد بچے ان سے کافی متاثر نظر آ رہے تھے۔ اپنی والدہ سے کہنے لگے: ''ہم سکول میں اپنے پرنسپل صاحب کو بھی ان پودوں کے فوائد کی بابت بتائیں گے۔ ہمیں یقین ہے وہ بھی انھیں سکول کے کمروں اور راہداریوں میں رکھوانا چاہیں گے۔''

مشق

سوال:

1. درون خانہ پودوں کے فوائد بتائیے۔
2. یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ درون خانہ پودوں کو روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی؟
3. درون خانہ پودوں کی پانی کی ضرورت کا تعین کس طرح کیا جا سکتا ہے؟
4. سکولینٹ پودوں کی خصوصیات بیان کریں۔ ان پودوں کی خاص ہیئت اور شکل کی وجہ بھی بتائیے۔
5. آپ اپنے درج ذیل کمروں میں کون سے پودے رکھنا چاہیں گے اور کیوں؟

i. بیڈروم ii. ڈرائنگ روم

سکول کا کام

بچوں کو قریبی نرسری لے جا کر ان کی مشاورت سے، سکول کے لیے درون خانہ پودوں کا انتخاب کیجیے۔ ان پودوں کو سکول میں موزوں جگہوں پر رکھوائیے اور ان کی مناسب نگہداشت کا اہتمام کیجیے۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیں کہ وہ اپنے والدین سے کہہ کر گھر پر بھی موزوں درون خانہ پودے رکھنے کا اہتمام کریں۔ انہیں یہ بھی بتائیں کہ ضروری نہیں اس مقصد کے لیے مہنگے پودے ہی استعمال کیے جائیں۔ بچوں کو پابند کیجیے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد وہ اس کی رپورٹ تحریری طور پر ٹیچر کو جمع کروائیں۔

ان دنوں میڈیا میں میاواکی جنگلات کا بہت تذکرہ تھا۔ بچے چونکہ ایسے تمام موضوعات میں دلچسپی لیتے تھے، ایک دن عمر صاحب سے پوچھنے لگے۔

"ابو! یہ میاواکی جنگل کیا ہوتا ہے؟"

"ارے واہ، میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی روز آپ لوگوں کو اس کے بارے میں بھی بتاؤں گا اور آج آپ نے خود ہی سوال کرلیا ہے" عمر صاحب یہ سوال سن کر مسکرا اُٹھے، "تو سنیں، اکیرا میاواکی ایک جاپانی ماہرِ نباتات تھا جو 1928ء میں پیدا ہوا اور 2021ء میں اُس نے وفات پائی۔ اُس نے عمر بھر کی تحقیق اور جستجو کے بعد جنگلات اُگانے کی ایک ایسی تکنیک دریافت کی جس کے ذریعہ قدرتی جنگلات سے دس گُنا تیز اور تیس گُنا گھنے جنگل اُگائے جاسکتے ہیں۔ ایسے جنگل کو میاواکی جنگل کہتے ہیں۔"

اس جواب نے بچوں کے ذہن میں کئی اور سوالوں کو جنم دے دیا۔ "انہوں نے ایسا کیا بتادیا کہ جنگل اس قدر تیز اور گھنے اُگ آتے ہیں؟" خضر پوچھنے لگا۔

"یہ تو کوئی بہت مشکل طریقہ ہی ہوگا۔" گُل نے تبصرہ کیا۔

"نہیں بھئی، یہ تو اتنا سیدھا سادہ طریقہ ہے کہ تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے" عمر صاحب بولے، "بس زمین کے کسی بھی قطعہ کو اس مقصد کے لیے تیار کریں، گوڈی کریں، بھل ڈالیں، قدرتی کھاد یا گوبر وغیرہ ملائیں اور پھر کسی نرسری سے مقامی درختوں کی مختلف اقسام کے چھوٹے چھوٹے پودے لاکر کسی ترتیب کے بغیر قریب قریب لگادیں۔ پہلے سال دو سال جڑی بوٹیاں صاف کرتے رہیں اور پانی بھی دیتے رہیں۔ اتنی دیر میں پودے خود جان پکڑ چکے ہوں گے اور آپ کو مزید دیکھ بھال نہیں کرنا پڑے گی۔ بس اگلے دس سال میں آپ کو سو سالوں کے برابر جنگل مل جائے گا۔"

"ان سالوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟" گُل سمجھنا چاہ رہی تھی۔

"فرق پڑتا ہے، بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک بھرپور قدرتی جنگل تقریباً سو سال میں وجود میں آتا ہے۔ اِس کا یہ بھی مطلب ہے کہ کوئی بھی ایک شخص یا نسل اپنی زندگی میں اپنی محنت کا پھل نہیں دیکھ سکتی۔ دوسری طرف ایک میاواکی جنگل محض دس سالوں میں جوبن پر پہنچ جاتا ہے اور یوں اس کو لگانے والے بھی اِس سے مُستفید اور لُطف اندوز ہوسکتے ہیں۔" عمر صاحب نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ جنگل کہاں لگائے جاتے ہیں؟" خضر نے پوچھا۔

"لگا تو آپ انھیں کہیں بھی سکتے ہیں لیکن شہروں اور دیگر گُنجان آباد علاقوں میں چونکہ آلودگی زیادہ ہوتی ہے اور زمین اور درخت کم، اس لیے وہاں یہ جنگل زیادہ فائدہ مند ہوسکتے ہیں۔ لیکن میں تو کہوں گا ایسے تیز رفتاری سے اُگنے والے جنگل تو ہر جگہ لگانے چاہییں۔" عمر صاحب نے جواب دیا۔

ابتدا

ایک مربع میٹر میں بغیر کسی ترتیب کے درختوں کی مقامی اقسام کے تین سے پانچ پودے لگائیے۔

عرصہ دو سال تک

ضرورت کے مطابق پانی دیجیے اور جڑی بوٹیوں کو تلف کیجیے۔

دس سال میں

ایک بھرپور جنگل کا لطف لیجیے۔

''اِس کے لیے کتنی زمین درکار ہوتی ہے؟'' خضر نے سوال پوچھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

''اِس کی حدود کو مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اسے چھوٹے سے چھوٹے قطعے پر بھی لگا سکتے ہیں۔ اِسی طرح زیادہ سے زیادہ حد کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ اِس کے سائز کا دارومدار جگہ اور دیگر وسائل کی دستیابی پر ہوتا ہے۔'' عمر صاحب نے وضاحت کی۔

''ابو! ایک بات تو بتائیں، درخت تو وہی ہوتے ہیں لیکن ایک قدرتی جنگل کی نسبت ایک میاواکی جنگل میں وہ تیزی سے کس طرح اُگتے ہیں؟'' خضر کے ذہن میں خاصی دیر سے یہ سوال اٹکا ہوا تھا۔

''بھئی بہت اچھا سوال ہے'' عمر صاحب نے پہلے تو خضر کی منطقی سوچ کی تعریف کی اور پھر کہنے لگے، ''جب مختلف اقسام کے پودے ایک دوسرے سے بہت قریب قریب لگائے جاتے ہیں تو سورج کی روشنی، پانی اور زمین میں موجود غذائی اجزاء کے لیے آپس میں سخت مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی مقابلہ بازی ان کی تیزی سے بڑھوتری کا سبب بن جاتی ہے۔''

''ابو، میاواکی تکنیک میں کیا کوئی قباحت بھی ہے؟'' خضر نے ایک اور اہم سوال کیا۔

''میں بتاؤں، جب کبھی جنگل میں آگ لگتی ہوگی تو ایک دوسرے کے قریب ہونے کے سبب سب درخت آگ پکڑ لیتے ہوں گے۔'' گُل جھٹ سے بولی۔ عمر صاحب نے مسکراتے ہوئے گُل کے اٹھائے ہوئے نکتے کی تائید کی، پھر کہنے لگے، ''اس سے بھی بڑی قباحت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنی ضرورت کے لیے قدرتی جنگلوں اور پرانے درختوں کو یہ کہہ کر کاٹنا شروع کر دیں کہ ہم میاواکی تکنیک سے جلد ان کا متبادل اُگا لیں گے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ قدرتی جنگل صدیوں میں نہیں تو کئی دہائیوں میں تشکیل پاتے ہیں اور پھر ان میں ہر طرح کی جنگلی حیات بھی پرورش پاتی اور پنپتی ہے۔ وہ ایک مکمل ماحولیاتی نظام (Ecosystem) ہوتا ہے۔ میاواکی جنگل کسی حد تک درختوں کی کمی کو پورا کرنے کا ایک اچھا نظام تو ہو سکتا ہے لیکن ایک بھرپور اور کامل قدرتی جنگل کا متبادل نہیں۔''

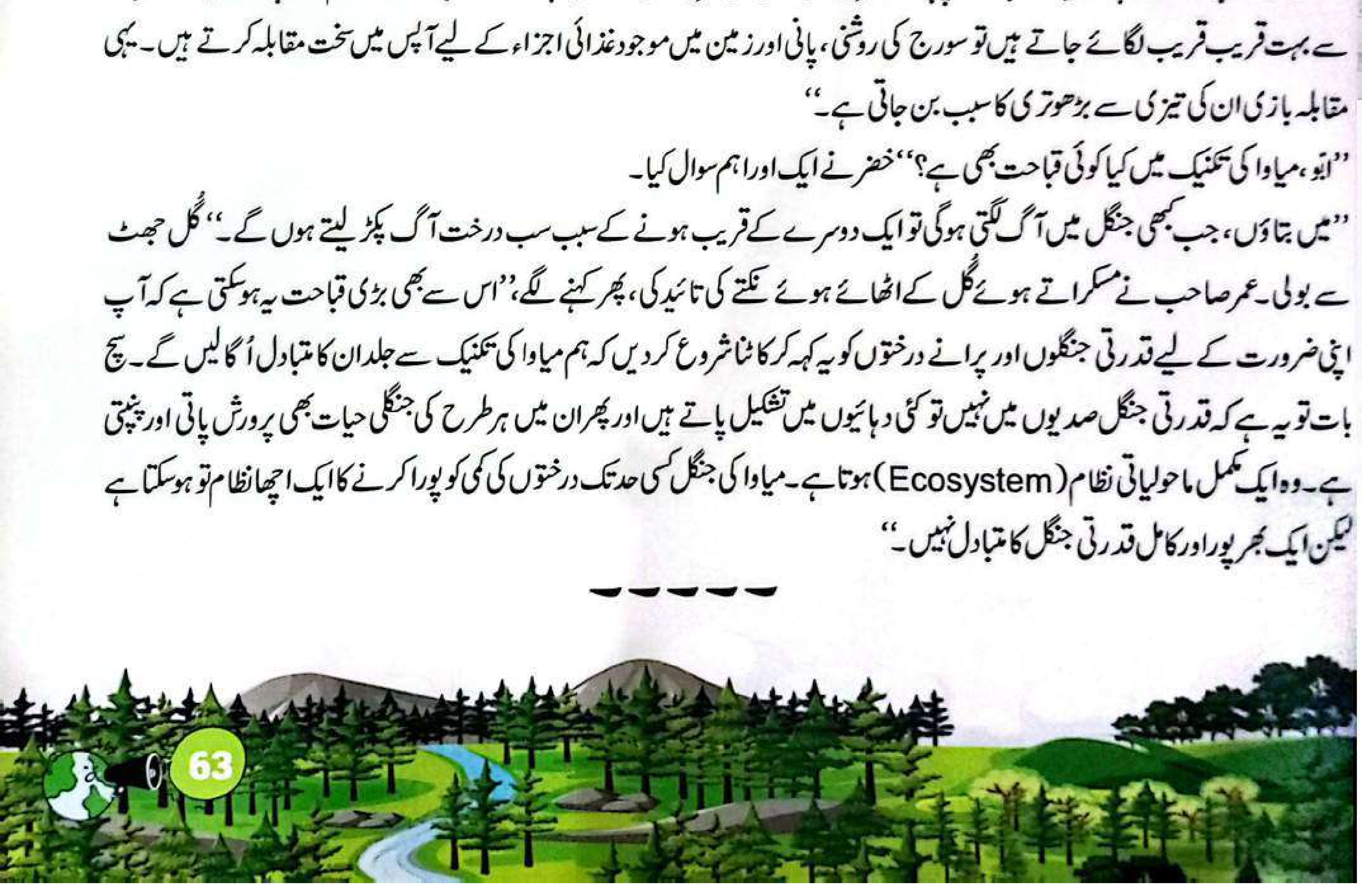

میاواکی تکنیک

- مقررہ قطعہ کی گوڈی کر کے مٹی کو اچھی طرح سے صاف اور نرم کر لیں۔
- بھل، قدرتی کھاد، گوبر، چاول کا چھلکا، لکڑی کا برادہ وغیرہ ڈال کر زمین تیار کریں۔ ایسی زمین نہ صرف زرخیز ہوتی ہے بلکہ اپنی نمی کو بھی قائم رکھتی ہے۔
- محکمہ جنگلات یا کسی نرسری سے مقامی درختوں کی مختلف اقسام کے چھوٹے چھوٹے پودے حاصل کیجیے۔
- حاصل شدہ پودوں کو کسی خاص ترتیب کے بغیر ایک دوسرے کے قریب قریب لگا دیا جائے۔ ایک مربع میٹر میں تین سے پانچ پودے لگائے جاسکتے ہیں، البتہ اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے پودے اکٹھے نہ لگائے جائیں۔
- جنگل کو مندرجہ ذیل چار تہوں یا سطحوں میں قائم کرنا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے:

1. پہلی تہہ تقریباً 6 فٹ تک اگنے والے بغیر تنے کے پودوں کی ہو۔
2. دوسری تہہ میں 25 فٹ تک کے بلند درخت ہوں۔
3. تیسری تہہ 40 فٹ تک اُگنے والے درختوں کی ہو۔
4. چوتھی تہہ میں 40 فٹ سے بلند درخت شامل ہوں۔

- بہتر ہوتا ہے کہ ابتدا میں چھوٹے پودوں کو سہارا دینے کے لیے انہیں چھڑیوں کے ساتھ باندھ دیا جائے۔
- پہلے دو سال تک پودوں کی نگہداشت کرنا پڑے گی، حسب ضرورت پانی دینا ہوگا، جڑی بوٹیوں کو تلف کرنا ہوگا، البتہ پودوں کی کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کیمیائی کھادوں سے پرہیز کرنا ہوگا اور محض قدرتی کھاد کو استعمال کیا جاسکے گا۔
- دو سال کے بعد جنگل میں کسی بھی قسم کی مداخلت ختم کر دی جائے اور اسے خود اُگنے دیا جائے۔
- تقریباً دس سال میں ایک لہلہاتا ہوا گھنا جنگل آپ کی نظروں کے سامنے ہوگا۔

صنوبر کے جنگلات

کوئٹہ سے تقریباً سوا سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع زیارت کے شہر میں ایک لاکھ دس ہزار ہیکٹر کے وسیع رقبہ پر صنوبر کے قدیم جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ تحقیق کے مطابق ان جنگلات میں کئی سو سال بلکہ تین سے چار ہزار سال پرانے درخت بھی موجود ہیں۔ ان درختوں کی قدامت سائنس دانوں اور دیگر محققین کو صدیوں پر محیط ارتقائی عمل اور موسمیاتی تبدیلی پر تحقیق کرنے اور یوں ماضی میں جھانکنے کے مواقع مہیا کرتی ہے۔ ان درختوں کی بڑھوتری کی رفتار انتہائی آہستہ اور زندگی بہت طویل ہوتی ہے۔

صنوبر کے جنگلات محض جنگلات ہی نہیں بلکہ یہ ایک مکمل ماحولیاتی اور حیاتی نظام (Ecosystem) ہیں۔ یہ جنگلات ریچھ، بھیڑیے، اڑیال اور مارخور جیسے تیزی سے معدوم ہوتے ہوئے جانوروں کو مساکن بھی مہیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مقامی افراد کے روزگار، خوراک، چارے، ایندھن اور تعمیراتی لکڑی کی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔

آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک طرف یہ درخت کٹتے چلے جا رہے ہیں تو دوسری طرف رہی سہی کسر موسمیاتی تبدیلی نے پوری کر دی ہے کہ جس کی بدولت صنوبر کے جنگلات کو اکثر خشک سالی کا سامنا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ان جنگلات کو بیماریوں اور کیڑوں نے بھی بہت نقصان پہنچایا ہے۔

زیارت کے علاقہ میں اگرچہ اب سوئی گیس پہنچائی جا چکی ہے لیکن ابھی بھی یہاں کے مکینوں کو گیس کے کم پریشر یا لوڈ شیڈنگ جیسے مسائل کا سامنا رہتا ہے جس کے سبب انھیں کھانا پکانے اور سرد موسم میں لکڑیاں جلانے کے لیے صنوبر کے جنگلات پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔

یاد رہے کہ زیارت کے حوالہ سے سب سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر بلکہ قابلِ فخر بات یہ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کیے تھے۔

مینگر ووز جنگلات

پاکستان میں سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں تقریباً ایک ہزار کلومیٹر طویل ساحلی پٹی موجود ہے۔اس پٹی پر مختلف انواع واقسام کے پیڑ پودے صدیوں سے موجود ہیں جن میں سب سے اہم پودے مینگر ووز کے ہیں۔مینگر ووز جنگلات تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار ہیکٹر پر پھیلے ہوئے ہیں۔تاریخی طور پر پاکستان کے پاس دنیا کے چھٹے بڑے مینگر ووز جنگلات تھے لیکن مسلسل کٹائی کی وجہ سے پاکستان کی درجہ بندی مسلسل تنزلی کا شکار ہے۔

فوائد

- کسی بھی ساحلی علاقے میں مینگر ووز کی موجودگی نہ صرف وہاں کے قدرتی ماحول کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ یہ زمین کے کٹاؤ کو بھی روکتے ہیں اور سمندر کی تیز لہروں کے خلاف ایک قدرتی دیوار کا کردار ادا کرتے ہیں۔
- مینگر ووز کے پودے دیگر پودوں کے مقابلے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرنے کی 18 فیصد زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے یہ نہایت ماحول دوست ہوتے ہیں اور فضائی آلودگی کم کرنے میں خاطر خواہ کردار ادا کرتے ہیں۔
- ان کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی جڑیں آبی حیات مثلاً چھوٹی مچھلیوں، جھینگوں اور کیکڑوں کے لیے افزائشِ نسل کی نرسریوں کا کام انجام دیتی ہیں۔یہ آبی حیات مقامی آبادی کے لیے خوراک اور اضافی آمدن کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔
- مینگر ووز جنگلات مقامی اور ہجرت کر کے آنے والے پرندوں کے لیے مساکن بھی مہیا کرتے ہیں۔
- مقامی آبادی مینگر ووز کی لکڑی کو بطور ایندھن استعمال کرتی ہے۔

لاحق خطرات

- زمینوں پر قبضے اور آبادکاری کے لیے مینگر ووز جنگلات کو بے دریغ کاٹا جا رہا ہے۔
- لکڑی کے حصول کے لیے سرگرم ٹمبر مافیا بھی ان جنگلات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا ہے۔
- مقامی آبادی ایندھن کے حصول کے لیے بھی انھی جنگلات کو کاٹتی ہے۔
- انڈس ڈیلٹا میں پانی کی کمی کے سبب یہ جنگلات اپنی بقاء کے لیے اشد ضروری میٹھے پانی سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔دوسری طرف سمندر بھی آہستہ آہستہ آگے چلا آ رہا ہے۔
- پانی میں شامل صنعتی اور رہائشی علاقوں کا فُضلہ بھی ان جنگلات کو شدید نقصان پہنچا رہا ہے۔
- آلودہ پانی کے سبب آبی حیات کی افزائشِ نسل بھی بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مقامی آبادی خوراک اور اضافی آمدن کے ذرائع سے محروم ہو رہی ہے۔

مطلوبہ اقدامات

مینگر ووز جنگلات کو بچانے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جس میں انڈس ڈیلٹا کو صاف پانی کی فراہمی، آلودہ پانی کی بغیر ٹریٹمنٹ نالوں، دریا اور سمندر میں پھینکنے پر پابندی، رہائشی اسکیموں کی تعمیر اور دیگر ضروریات کے لیے جنگلات کے کٹاؤ کی روک تھام اور عوام میں ان جنگلات کے حوالے سے شعور اُجاگر کرنا شامل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کو متبادل ایندھن بھی فراہم کیا جانا چاہیے تاکہ وہ اپنی ضروریات کے لیے ان جنگلات کو نہ کاٹیں۔

مشق

سوال:

1. میاواکی اور قدرتی جنگل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے دونوں اقسام کا موازنہ کیجیے۔ کون سا جنگل کس جگہ موزوں رہتا ہے؟
2. تصوّر کیجیے، آپ ایک درخت ہیں۔ ایک مضمون کی شکل میں اپنی روداد بیان کیجیے کہ آپ کو موجودہ حالات میں کن کن مشکلات کا سامنا ہے؟
3. اپنے آس پاس درختوں کی کٹائی کو روکنے کے لیے آپ کن اقدامات کی تجویز دیں گے؟
4. محققین کے نزدیک صنوبر کے جنگلات کی کیا اہمیت ہے؟ ان کے بچاؤ کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہییں؟
5. مینگرووز جنگلات کے فوائد، انھیں لاحق خطرات، اور اس حوالہ سے مطلوبہ اقدامات پر روشنی ڈالیے۔

عملی کام

سکول کا کام

سکول میں کسی موزوں قطعے پر، دی گئی ہدایات کے مطابق، بچوں کے ساتھ مل کر میاواکی جنگل قائم کیجیے اور اس کی نگہداشت کیجیے۔

گھر کا کام

بچے اپنے گھر والوں کو بھی میاواکی تکنیک کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔ بلکہ اپنے بڑوں سے کہیں کہ آس پڑوس کے لوگوں کو بھی میاواکی تکنیک اور اس کی افادیت سے آگاہ کریں۔ ہو سکے تو سب لوگ مل کر، متعلقہ محکمہ یا انتظامی کمیٹی کی اجازت سے، قریبی پارک میں کسی موزوں جگہ پر میاواکی جنگل کی بنیاد ڈالیں اور اس کی دیکھ بھال کریں۔

موسمیاتی تبدیلی کا تدارک کرنا ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بقا کا معاملہ ہے۔ یہ اس قدر بڑا چیلنج ہے کہ محض حکومتی سطح پر اس سے نبرد آزما ہونا ممکن نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام میں اس سے متعلق شعور اُجاگر کیا جائے اور انھیں عملی اقدامات پر اُبھارا جائے۔ اس حوالہ سے محکمہ تعلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ نئی نسل کو موسمیاتی تبدیلی کے تمام پہلوؤں سے روشناس کرنے کے لیے ساتویں کی سطح پر باقاعدہ ایک مضمون متعارف کروایا جائے۔ چونکہ اس مضمون کو پڑھانے کے لیے متعلقہ ڈگری کے حامل یا تربیت یافتہ اساتذہ دستیاب نہیں تھے، اس لیے پہلے ہی سے موجود ایسے اساتذہ کو یہ ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کیا گیا جو جغرافیہ، بیالوجی، سائنس، معاشرتی علوم یا اس نوعیت کے دیگر مضامین پڑھا رہے تھے۔ محکمہ تعلیم نے یہ ہدایات تمام سکولوں کو جاری کر دیں۔

خضر کے سکول کے پرنسپل عبدالحمید وائیں ایک بہترین منتظم اور جوہر شناس شخص تھے۔ سرخ و سفید رنگت، سنہرے بال اور خوش لباسی ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ دل اور دماغ کی بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ سکول اور اس میں زیرِ تعلیم بچے ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ وہ اپنی ذمہ داریاں انتہائی اخلاص اور محبت سے ادا کرتے تھے بلکہ اگر یوں کہہ لیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو نوکری نہیں، عبادت سمجھ کر ادا کیا کرتے تھے تو بھی شاید غلط نہ ہوگا۔ سکول کے ہر اک معاملے پر نظر رکھتے تھے۔ موسمیاتی تبدیلی کو بطور مضمون متعارف کروانے کے حوالہ سے اُنھوں نے سارے سٹاف کی میٹنگ بُلا کر یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا اور ان کی رائے طلب کی۔ جیکب پیٹر ِگل مختلف جماعتوں کو حساب، سائنس اور جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ ان کا شمار سکول کے قابل اور مقبول ترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ جب اس مضمون کے لیے استاد چُننے کا مرحلہ آیا تو اُنھوں نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس نشست میں شریک سب اساتذہ نے تالیاں بجا کر ان کے جذبے اور عزم کو سراہا۔ بچوں کو جب یہ پتا چلا کہ نیا مضمون انھیں سر جیکب پڑھائیں گے تو ان میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا، وہ سب بچوں سے انتہائی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ نہ صرف انھیں سب بچوں کے نام ازبَر تھے وہ ان کے والدین سے بھی رابطہ رکھتے تھے، یوں وہ بچوں کے گھریلو حالات سے بھی آگاہ رہتے تھے۔ بچے ان سے اس قدر مانوس تھے کہ اپنے چھوٹے بڑے مسائل پر بھی ان سے رہنمائی اور مدد لیتے رہتے تھے۔

تدریس کے حوالہ سے تو وہ ہر بچے پر انفرادی توجہ دیا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر بچہ انفرادی شخصیت کا مالک ہوتا ہے اور پڑھانے کا ایک ہی طریقہ سب بچوں کے لیے مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ اپنے مضامین کے عملی کام تو خاص طور پر وہ اس طرح کرواتے تھے کہ بچوں کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی بڑا اُن سے کام کروا رہا ہے، انھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سر جیکب اُن میں سے ہی ہیں اور اُن کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔

سر جیکب کی ایک اور قابلِ ستائش بات یہ تھی کہ وہ طلباء کو سوال پوچھنے پر اُکساتے اور اپنی جماعت میں بحث و مباحثے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ اس بات کے پوری طرح قائل تھے کہ سیکھنے کا عمل پوری زندگی ختم نہیں ہوتا۔ ایک استاد میں تو سیکھنے کی لگن طالب علموں سے بھی بڑھ کر ہونی چاہیے کیونکہ اسے نہ صرف خود سیکھنا ہے بلکہ دوسرے لوگوں کو سکھانے کی ذمہ داری بھی نبھانی ہوتی ہے۔

نئے مضمون کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کا مرحلہ آیا تو سر جیکب نے لائبریری اور بازار سے کچھ کتابیں لے کر ان کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انٹرنیٹ پر مستند ذرائع سے ضروری مواد اکٹھا کیا۔ عملی کام سیکھنے اور سکھانے کے لیے تو خاص طور پر اُنھوں نے انٹرنیٹ پر موجود ویڈیوز سے بھی استفادہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے حلقۂ احباب میں، اور اُس سے باہر بھی، شعبہ کے ماہرین تک رسائی حاصل کی اور اُن سے رہنمائی لی۔ معلومات کے براہِ راست حصول کے لیے وہ نرسریوں کا چکر بھی لگاتے رہے۔ تجربہ کار مالیوں سے بھی اُنھوں نے خوب معلومات حاصل کیں۔

چند ہی دنوں میں جب وہ یہ نیا مضمون پڑھانے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے تو انہوں نے پرنسپل صاحب کو اس کی بابت آگاہ کیا۔ پرنسپل صاحب نے ان کے مشورہ سے ہفتہ میں دو پیریڈ اس مضمون کے لیے مختص کر دیے۔ اس بات کا بھی خاص اہتمام کیا گیا کہ وہ پیریڈ دن کے آخری پیریڈ ہوں تاکہ اگر عملی کام کے دوران بچوں کے ہاتھ یا کپڑے گندے ہو جائیں یا ان کو پسینہ آ جائے تو اُنھیں لوٹ کر کلاسوں میں نہ جانا ہو۔ چونکہ عملی کام اس مضمون کا ایک لازمی جزو تھا، شدید سردی یا گرمی کے دنوں میں اسے پڑھانے کے سلسلہ کو وقتی طور پر روک دیے جانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

پرنسپل صاحب چونکہ سر جیکب کی کام سے لگن اور محنت کے پہلے سے ہی قائل تھے، وہ ان کی رائے اور مشورہ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اسی لیے سر جیکب نے باغبانی کے ضروری اوزار مثلاً کھرپی، بیلچے، درانتی، فوارہ، پانی والے پائپ، گھاس کاٹنے والی مشین جیسی مطلوبہ اشیا کی فہرست پرنسپل صاحب کو فراہم کی تو انہوں نے بلا چوں چرا اسے منظور کر لیا۔ سر جیکب نے تو پرنسپل صاحب کو اس بات پر بھی آمادہ کر لیا کہ بچوں کے عملی کام کے

لیے ایپرن اور دستانے لیے جانے چاہییں تا کہ جس قدر ممکن ہو، بچوں کے کپڑوں اور ہاتھوں کو گندا ہونے سے بچایا جا سکے۔ سکول کے مالیوں کو بھی جالی والی سبز جیکٹیں پہننے کی ہدایات جاری کی گئیں۔

عملی کام کے لیے جگہ مختص کرنے کا مرحلہ آیا تو سارے سکول کا بغور جائزہ لیا گیا۔ کھیل کے میدانوں کو چھوڑتے ہوئے سکول کی ایک جانب تیس فٹ چوڑا اور ساٹھ فٹ لمبا قطعہ میاواکی جنگل اُگانے کے لیے پسند کیا گیا۔ ایک اور جانب، تقریباً اتنا ہی قطعہ کچن گارڈننگ کے لیے چُنا گیا۔ اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا کہ ان دونوں قطعات کو دن کے بیشتر اوقات میں براہ راست سورج کی روشنی میسر رہتی ہو۔

سکول کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے پانی کا بھی کوئی تسلی بخش ذریعہ موجود نہ تھا۔ اِدھر اُدھر لوگوں سے مشورہ کیا تو شمسی توانائی پر چلنے والے زیرِ زمین پمپ کی تجویز سامنے آئی کہ پانی بھی وافر دیتا ہے اور بل کی بھی بچت ہو جاتی ہے۔ پرنسپل صاحب نے یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ سکول میں 'سبز یا سرمئی' کے اصول کو اپنایا جائے گا۔ تمام کچے قطعات پر معیاری گھاس لگانے یا پودوں اور پھولوں کی کیاریاں بنانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ راستوں اور گزرگاہوں کو البتہ پکا کر دیا گیا۔ اس حوالہ سے باقاعدہ مشاہدہ کیا گیا کہ سکول کے طلباء اور عملہ کو کن راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے اور انھیں بھی پکا کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ بعض جگہوں پر پودوں کی باڑ بھی لگائی گئی تا کہ میدان اور گھاس محفوظ رہ سکیں۔ اس مشق کی تکمیل کے بعد پکے راستوں اور گزرگاہوں سے ہٹ کر چلنے پر باقاعدہ پابندی عائد کر دی گئی اور متعلقہ جگہوں پر بورڈ بھی آویزاں کر دیے گئے۔

سرجیکب کی ایما پر پرنسپل صاحب نے بھَل یعنی دریائی مٹی کی ٹرالیاں بھی منگوا کر قطعات اور میدانوں میں ڈلوائیں تا کہ زمین کی زرخیزی کو بڑھایا جا سکے۔ چھوٹے قطعات کو لکڑی کی تختیوں کی مدد سے جبکہ بڑے میدانوں کو ٹریکٹر کے پیچھے لیزر لیولر لگا کر ہموار کیا گیا۔ سرجیکب پانی چھوڑ کر یا بارش کے بعد بھی میدانوں کا بغور جائزہ لیتے تھے اور جس جگہ پانی کھڑا دیکھتے تھے، بھانپ لیتے تھے کہ وہاں ابھی زمین کو ہموار کرنے کی گنجائش ہے۔

پرنسپل صاحب یوں تو ہر معاملہ میں احتیاط برتتے تھے لیکن سکول کے فنڈ کے حوالہ سے تو خاص طور پر محتاط واقع ہوئے تھے۔ اگر سکول یا وہاں پڑھنے والے بچوں کا فائدہ ہوتا نظر آتا تھا تو خرچ کرنے میں پل بھر کی بھی دیر نہ کرتے تھے، لیکن اگر خرچ محض اسراف کے زمرے میں آتا تھا تو اس سے ہر ممکن اجتناب کرتے تھے۔ اُنھوں نے سکول کے تین سینیئر اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی تھی۔ سرجیکب کو سکول کے لیے جب بھی کوئی بڑا خرچ کرنا مطلوب ہوتا تھا، معاملہ کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو سرجیکب کے ساتھ مل بیٹھ کر اس کا جائزہ لیتی تھی اور پھر اپنی تجاویز پرنسپل صاحب کو پیش کرتی تھی۔ چھوٹے موٹے خرچوں کی منظوری تو پرنسپل صاحب خود ہی دے دیا کرتے تھے۔ زیادہ رقم درکار ہونے کی صورت میں وہ معاملہ منظوری کے لیے سکول کونسل کے اجلاس میں لے جاتے تھے جس میں اساتذہ، محکمہ تعلیم، ضلعی انتظامیہ، معززینِ شہر اور والدین کے نمائندے شامل تھے۔

چند ہی دنوں میں سکول کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ ہر طرف ہریالی نظر آنے لگی۔ موسم برسات آیا تو گھاس بھی خوب پھلی پھولی، ڈھونڈنے سے بھی سکول میں کوئی کچا قطعہ نہ دِکھتا تھا۔ کیاریاں بھی رنگ برنگے موسمی پھولوں سے بھر گئیں۔ بیلوں نے بھی رسیوں اور ڈوریوں سے لپٹ کر دیواروں اور چھتوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ درختوں کی کانٹ چھانٹ کر کے ان میں بھی ایک نظم اور ترتیب لائی گئی۔ مقامی اقسام کے درختوں اور مختلف موسموں میں کھلنے والے پھولوں کے پودوں کی مستقل اور کم خرچ فراہمی کے لیے سکول میں ایک نرسری بھی قائم کر دی گئی۔ یہ نرسری بعد میں اس قدر پھلی پھولی کہ پرنسپل صاحب نے قُرب وجوار کے دیگر سکولوں کو بھی خیر سگالی کے جذبہ کے تحت پودے بھجوانے شروع کر دیے۔

اس نئی صورتحال میں مالیوں کو بھی سکول میں مرکزیت ملنا شروع ہوگئی۔ پرنسپل، اساتذہ اور بچوں کو اپنے ساتھ کام کرتا دیکھ کر ان میں ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی اور اُنھوں نے اپنا کام پہلے سے بھی کہیں زیادہ محنت اور لگن سے کرنا شروع کر دیا۔ رہی سہی کسر سر جیکب اور ہفتم جماعت کے بچوں نے پوری کر دی۔ ابتدائی کچھ دنوں میں تو بچوں کو سبز کتاب کی مدد سے موسمیاتی تبدیلی پڑھائی جاتی رہی، عملی کام کے دن آئے تو بچوں کا جوش و خروش دوبالا ہوگیا۔ اُنھوں نے باغبانی کے اوزاروں کا استعمال سیکھا، مالیوں کے ساتھ مل کر درختوں کی کانٹ چھانٹ کی، گھاس لگائی، کیاریاں بنانا شروع کر دیں، اور پھولوں کے پودے لگائے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ ہفتم جماعت کے ہر بچے کے ہاتھوں سے اس کے نام کا ایک پودا لگوایا گیا۔ جتنا عرصہ اسے اس سکول میں زیرِ تعلیم رہنا تھا، اس پودے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ یوں ان پودوں نے چند ہی سالوں میں ان بچوں کی نظروں کے سامنے ہی درختوں میں ڈھل جانا تھا اور اُنھوں نے سب کو بڑے فخر سے بتانا تھا کہ یہ درخت ان کا لگایا اور سنبھالا ہوا ہے۔ کچھ درخت تو سکول میں پہلے ہی لگے ہوئے تھے لیکن پرنسپل صاحب اور سر جیکب نے اس بار اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ امرود، جامن، بیر اور اس نوع کے دیگر پھل دار درخت لگائے جائیں۔ بچوں نے وجہ جاننا چاہی تو بتایا گیا کہ سڑک کے کناروں، پارکوں اور دیگر کھلی جگہوں پر پھل دار درخت لگانے کا خاص فائدہ تو ہوتا نہیں کہ لوگ کچے پھل ہی توڑ کر کھا جاتے ہیں لیکن سکول کی چار دیواری کے اندر اس کا احتمال نہیں تھا۔ سب کو قوی امید تھی کہ اگر بچوں میں شعور اُجاگر کیا گیا تو کوئی بھی کچے پھل نہ توڑے گا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکے گا۔ ایک منچلے نے تو یہ بھی پوچھ لیا کہ پک جانے کے بعد یہ پھل کسے کھانے کو ملیں گے۔ اس حوالہ سے سر جیکب نے بچوں کے سامنے دو تجاویز رکھیں۔ ایک تجویز تو یہ تھی کہ سکول کے بچّوں کو کھِلا دیے جائیں، اور دوسری یہ کہ ان کے پیکٹ بنا کر اطراف میں جو غریب گھرانے تھے، ان کو تحفتاً دے دیے جائیں۔ اگرچہ بچّوں کو دوسری تجویز زیادہ پسند آرہی تھی لیکن انتظامیہ نے باہم مشورے اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پھل اور سبزیاں جیسے جیسے تیار ہوتے جائیں گے سکول کے مالیوں اور بچوں میں بھی تقسیم کیے جائیں گے

اور انھیں ان بچّوں کے ہاتھوں اطراف میں بسنے والے غریب گھرانوں میں بھی بانٹا جائے گا۔ اس فیصلے کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ بچّوں میں ہمدردی اور ایثار جیسے جذبات کو فروغ ملے گا اور وہ اپنی خوشیوں اور محنت کے پھل میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنا بھی سیکھیں گے۔

میاواکی جنگل سے متعلق سبق پڑھا تو عملی کام کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ سر جیکب، بچوں اور مالیوں نے مل کر پہلے میاواکی جنگل کے لیے مختص قطعہ کی گوڈی کی اور اس میں بھل، ریت اور قدرتی کھاد کی آمیزش کی۔ کچھ روز میں محکمہ جنگلات اور قریبی نرسریوں کی مدد سے مقامی درختوں کی مختلف اقسام کے پودوں کا انتظام کیا گیا۔ ان پودوں کو آپس میں ملا کر بغیر کسی ترتیب کے ایک دوسرے سے قریب قریب لگا دیا گیا۔

موسم کی مناسبت سے اس جنگل کو پانی دینے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جڑی بوٹیوں اور غیر ضروری پودوں کو باقاعدگی سے تلف کیا جانے لگا۔ چند ہی ہفتوں میں وہاں جنگل اُگنے کے آثار نمودار ہونے لگے۔ بچے اور بڑے اپنی کاوش کے اس نتیجہ کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

کچن گارڈننگ سے متعلق سبق بھی سر جیکب نے بچّوں کو اس کے لیے مخصوص قطعہ میں عملی کام کی شکل میں ہی پڑھایا۔ سر جیکب نے اس مقصد کے لیے گملوں کا بھی اہتمام کیا تاکہ وہ بچے بھی پوری طرح مُستفید ہوسکیں جن کے گھروں میں لان نہیں ہیں۔ زمین کی گوڈی کی گئی، بھل اور قدرتی کھاد کی آمیزش کی گئی، موسمی سبزیوں کے بیج اور پنیریاں کاشت کی گئیں، مناسب دیکھ بھال کی گئی۔ جلد ہی ان بیجوں سے چھوٹے چھوٹے پودے پھوٹ پڑے۔ اگلے دو تین مہینوں میں پودوں پر سبزیاں پکنا شروع ہوگئیں۔ سر جیکب بہت اچھا کھانا بھی پکالیا کرتے تھے۔ جب کوئی سبزی تیار ہوجاتی، کسی روز سر جیکب پرنسپل صاحب کی اجازت سے سکول کے باورچی خانہ میں اپنی جماعت کے بچوں کے ساتھ مل کر پکاتے، کوئی نہ کوئی مالی چچا بازار سے روٹیاں لے آیا کرتے اور یوں سب مل کر اپنی محنت کا پھل کھاتے تھے۔

مالیوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ درختوں اور پودوں کے گرے ہوئے پتے ایک بڑے ڈرم میں اکٹھے کرتے رہا کریں۔ پرنسپل صاحب نے سکول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ضروری مقامات پر کوڑے کی ٹوکریاں تو رکھوائی ہوئی تھیں اور اس حوالہ سے بچّوں کی تربیت بھی کر رکھی تھی، اب اُنھوں نے کچھ مقامات پر دیگر رنگوں کے ساتھ ساتھ سبز ٹوکریاں بھی رکھوادیں اور بچوں کو سکھادیا کہ وہ بچا کھچا کھانا ان میں ڈال دیا کریں۔ یوں بچے اپنی روٹی، سینڈوچ، پھل یا بچ جانے والی کھانے کی دیگر اشیا ان سبز ٹوکریوں میں ڈالنا شروع ہوگئے۔ مالی حضرات ان ٹوکریوں میں جمع شدہ اشیا اور درختوں کے گرے ہوئے پتوں کو گڑھا کھود کے زمین میں دبادیا کرتے تھے تاکہ ان کی مدد سے قدرتی کھاد تیار کی جائے اور ضرورت پڑنے پر سکول میں استعمال کی جاسکے۔

طلبہ کی مدد سے سکول میں وقتاً فوقتاً علامتی طور پر صفائی کی مہمات بھی چلائی جانے لگیں تاکہ اس حوالہ سے بھی بچوں میں شعور اور آگہی پیدا کی جاسکے، اور ان میں احساسِ ذمہ داری کو اجاگر کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے کوڑا اٹھانے والے چمٹے، دستانے اور بڑے لفافے بھی خریدے گئے۔ ہر دوسرے روز ساتویں جماعت کے کسی نہ کسی سیکشن کے بچے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں اس سرگرمی میں مشغول نظر آتے تھے۔

اس اثنا میں پرنسپل صاحب نے سکول میں پلاسٹک کی ایسی اشیا پر بھی پابندی لگادی جنھیں محض ایک دفعہ ہی استعمال میں لایا جاسکتا تھا اور بعد ازاں وہ کوڑا کرکٹ کی شکل میں زمینی آلودگی یا پانی کے بہاؤ میں رکاوٹ بنتی تھیں۔ شاپنگ بیگ، لفافے، گلاس، پلیٹیں، پانی کی بوتلیں اور اس نوعیت کی دیگر اشیا اس فہرست میں شامل کی گئیں۔

سر جیکب بچوں کو یہ ہدایت بھی کرتے تھے کہ وہ جو نئی بات سکول میں سیکھتے ہیں انہیں اپنے والدین کے علم میں بھی لایا کریں۔ کچن گارڈننگ کے

بارے میں تو وہ خاص طور پر بچوں کو ہدایت کرتے تھے کہ اپنے والدین کو بھی اس کی ترغیب دیا کریں۔ اس حوالہ سے وہ بچوں کو گھر کا کام بھی دیا کرتے تھے اور اس کے بارے میں رہنمائی کرتے تھے اور باز پرس بھی۔

بچوں کے ساتھ ساتھ سر جیکب مالیوں کی تربیت کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ جونئی بات خود سیکھتے تھے مالیوں کو بھی سکھاتے تھے۔ یہ سیکھنے کا عمل یکطرفہ نہیں تھا، سر جیکب بھی تقریباً ہر معاملہ میں مالیوں سے مشورہ کرتے تھے اور ان کے تجربہ سے مُستفید ہوتے تھے۔ مکرر عرض ہے کہ مالیوں کو بھی جب سکول میں شناخت اور اہمیت ملنا شروع ہوگئی تو اُنھوں نے پہلے سے بھی زیادہ دل لگا کر اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کی اس قدر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ ان کی ساری تکان دور ہو جایا کرتی تھی۔

ان دنوں جب محکمہ تعلیم یا ضلعی انتظامیہ کا کوئی افسر سکول کے دورہ پر آیا کرتا تھا تو لامحالہ اس سکول کو سبزے اور صفائی کے لحاظ سے علاقے کے سبھی سکولوں سے بہتر پاتا تھا اور کُھل کر اس کا اظہار کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے تو پرنسپل صاحب نے سکول کی تازہ تصاویر کے ساتھ ساتھ پرانی تصاویر بھی سنبھال رکھی تھیں تا کہ آنے والے مہمانوں کو موازنہ کی خاطر دکھائی جا سکیں کہ سکول میں بہتری کا سفر کہاں سے شروع ہوا اور مختلف مراحل طے کرتے ہوئے کہاں تک پہنچا۔ اس موقع پر پرنسپل صاحب اس کارکردگی کو اپنے سٹاف، اساتذہ اور بچوں کی محنت سے منسوب کیا کرتے تھے۔

وہ سکول اس امر کا عملی ثبوت تھا کہ مل جل کر محنت کرنے سے بڑے سے بڑے مقصد کو بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مشق

سوال:

1. 'سبز یا سرمئی' کے اصول سے کیا مراد ہے؟ اس حوالہ سے سکول میں کیا اقدامات کیے جانے چاہییں؟
2. اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ سکول میں گھاس کے میدانوں میں گزرگاہیں نہ بنیں اور گھاس خراب نہ ہو، ایک حکمتِ عملی وضع کیجیے اور اس کے اہم نکات تحریر کریں۔
3. ایک عام شخص جسے پہلے کبھی باغبانی، شجرکاری یا اس نوعیت کے دیگر اشغال سے واسطہ نہ پڑا ہو، ان کی بابت ابتدائی معلومات کن طریقوں سے حاصل کرسکتا ہے؟
4. سکول میں کام کرنے والے مالیوں کو کس طرح پہلے سے بھی زیادہ متحرک کیا جاسکتا ہے؟
5. آپ کی رائے میں سکول میں تیارشدہ سبزیوں اور پھلوں کا کیا مصرف ہونا چاہیے؟

عملی کام

سکول کا کام

بچوں کو پانچ پانچ، چھ چھ کے گروپوں میں تقسیم کریں اور انھیں اس سبق کے مطابق سکول کو سرسبز وشاداب بنانے کے لیے حکمتِ عملی مُرتّب کرنے کا کہیے۔ ان گروپوں کو اپنی اپنی حکمتِ عملی ساری جماعت کے سامنے پیش کرنے کا کہیں اور تین بہترین حکمتِ عملیوں کی نشان دہی کیجیے۔ ان حکمتِ عملیوں کو مجتمع کر کے بچوں کی مدد سے ایک جامع اور قابلِ عمل حکمتِ عملی ترتیب دیں اور پھر اس پر مرحلہ وار عمل کرنا اور کروانا شروع کریں۔

گھر کا کام

بچوں کو اس امر کی ترغیب دیجیے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ گھر والوں کے ساتھ مل کر اپنے گھروں اور محلوں میں بھی 'سبز یا سرمئی' کے اصول کو لاگو کریں اور بعدازاں اس حوالہ سے ایک تحریری رپورٹ آپ کو جمع کروائیں۔

پارک کی دیکھ بھال

خضر اور گُل کے گھر سے کچھ فاصلہ پر کچنار پارک تھا۔ ان کے ابوّ کی خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ وہ سب لوگ علی الصُبح وہاں سیر اور ورزش کے لیے جایا کریں۔ شام کو بھی ان کا اکثر وہاں جانا ہوتا تھا خاص طور پر اس روز جب موسم بہت خوش گوار ہو۔ وہ سب لوگ اس پارک سے بہت محبت کرتے اور اس کا خیال اپنے گھر کے لان کی طرح رکھتے تھے۔ انھیں اس بات پر افسوس ہوتا تھا کہ بعض غیر ذمہ دار لوگ خالی ڈبّے، بوتلیں، لفافے اور اس نوعیت کی دیگر اشیا استعمال کے بعد پارک میں پھینک دیتے تھے۔ شروع شروع میں تو عمر صاحب اپنے بچوں کے ساتھ مل کر ان اشیا کو خود ہی اٹھا دیا کرتے تھے، پھر پارک میں باقاعدگی سے آنے والوں نے اپنی ایک کمیٹی بنالی۔ اس کمیٹی نے پارکوں کی دیکھ بھال کرنے والے محکمہ سے بات کر کے پارک میں کچھ جگہوں پہ کوڑے والے ڈرم لگوادیے، تھوڑی بہت جو کمی رہ گئی وہ ان سب نے آپس میں چندہ جمع کر کے پوری کر دی۔ اس کمیٹی کے اراکین نہ صرف پارک میں کوڑا پھیلانے والے لوگوں کو مہذب انداز میں سمجھاتے بلکہ ہر دوسرے روز بڑے بڑے لفافے اور خصوصی چمٹے لے کر باغ کی صفائی بھی کرتے تھے۔ یہ اراکین درختوں کی کٹائی پر بھی خاص نظر رکھتے اور کسی بھی بلا اجازت سرگرمی کو نہ صرف خود روکتے بلکہ متعلقہ محکمہ کو بھی اطلاع دیتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ٹیلی فون نمبر بھی پارک میں نمایاں جگہ پر لکھوائے گئے تھے۔

ایک اور اہم ذمہ داری جو کمیٹی کے اراکین محکمہ کے افسران کے ساتھ مل کر ادا کرتے تھے وہ مالیوں کے کام کی نگرانی تھی، جن کی ڈیوٹی کا شیڈول اور اوقات کار بھی پارک کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیے گئے تھے۔ اگر کوئی مالی بغیر اطلاع اور اجازت کے غیر حاضر ہوتا تو پہلے تو فون پر اس کی خیریت دریافت کرتے اور خیریت کی صورت میں نہ آنے کی وجہ پوچھتے تھے۔ یہ نوبت کم ہی آتی تھی کیونکہ مالی بھی اپنا کام محبت اور محنت سے کرتے تھے۔

ایک روز سیر کے دوران عمر صاحب پوچھنے لگے: ''بچو! پارک کیوں اچھے ہوتے ہیں؟''

دونوں بچے جواب دینا چاہتے تھے لیکن خضر نے گُل کو چھوٹا ہونے کے سبب پہلے بولنے کا موقع دیا: ''اس لیے کہ ہمیں یہاں آکر اچھا لگتا ہے، درخت، پودے، پھول سب بھلے لگتے ہیں۔''

''اور پھر ہمیں یہاں کُھلے ماحول میں بھاگنے، دوڑنے اور کھیلنے کا بھی موقع ملتا ہے۔'' خضر اپنی باری پر بولا۔

''اتنا تو ٹھیک کہا، لیکن اور سوچیں۔'' عمر صاحب نے بچوں کو مزید غور و فکر پر اُکسایا۔

''میں بتاؤں ابو، یہاں پرندے اور دوسرے جانور بھی تو رہتے ہیں۔'' گُل نے کہا۔

''اور یہاں آنے سے لوگوں کی پودوں، درختوں اور پرندوں کے بارے میں معلومات بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔'' خضر کو فوراً یاد آ گیا کہ جب اُنھوں نے پہلے پہل باغ میں آنا شروع کیا تھا تو کیسے اُن کے ابو نے ان کو ایک ایک درخت کے پاس لے جا کر ان کے نام اور خواص سے آگاہ کیا تھا۔

''یہ درخت ہمیں پھل اور پھول بھی تو دیتے ہیں۔'' گُل بولی۔

''اور جلانے کے لیے لکڑیاں بھی۔'' خضر نے گرہ لگائی۔

''بھئی آپ دونوں تو سب جانتے ہیں، لیکن کچھ فوائد میں بھی بتائے دیتا ہوں'' عمر صاحب بولے، ''آپ کو پتا ہے جس جگہ پر کثرت سے درخت لگائے گئے ہوں وہاں درجۂ حرارت دو سے آٹھ ڈگری سینٹی گریڈ تک کم ہو جاتا ہے۔ اور تو اور کسی عمارت کے اردگرد لگائیں تو اسے ٹھنڈا بھی رکھتے ہیں اور ایئر کنڈیشنر کے استعمال کو بھی کم کرتے ہیں۔ گویا بجلی کی کھپت اور ایئر کنڈیشنر سے خارج ہونے والی مُضرِ صحت گیسوں میں کمی لاتے ہیں۔ درخت ویسے بھی تو کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی یہ درخت فلٹر کے طور پر کام کرتے ہیں اور فضا میں مُعلق مُضرِ صحت ذرّات کو جذب کر لیتے ہیں۔ اور تو اور ان کی جڑیں زیرِ زمین پانی کے معیار کو بھی بہتر بنا دیتی ہیں۔''

''پھر تو ہمیں شہر میں ہر جگہ درخت لگا دینے چاہییں۔'' خضر یہ سب سن کر بولا۔

''تو اور کیا، شہروں میں چونکہ دیہات کی نسبت سبزہ تھوڑا ہوتا ہے اس لیے ہر ممکنہ جگہ پر پودے اور درخت لگانے چاہییں، جیسے گھروں کے لانوں، پارکوں، سڑک کے کناروں، چوکوں، چوراہوں، خالی پلاٹوں، تعلیمی اداروں، ملوں، فیکٹریوں، حتیٰ کہ قبرستانوں میں بھی۔'' عمر صاحب نے جواب دیا۔

''شہروں میں شجر کاری تو باقاعدہ ایک سائنس ہے جسے شہری شجر کاری (Urban Foresty) کہا جاتا ہے۔'' انھوں نے مزید وضاحت کی۔

''درخت فضائی اور زمینی آلودگی بھی تو کم کرتے ہیں۔'' خضر نے یاد دلایا۔

"بالکل ٹھیک، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آلودگی صرف ہوا اور پانی وغیرہ کی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایک قسم شور کی آلودگی (Noise Pollution) بھی ہے۔ مثلاً اگرچہ پڑھے لکھے معاشروں میں بغیر کسی اشد ضرورت کے ہارن بجانے کو ویسے بھی بدتہذیبی میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس عمل کی ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ شور کی آلودگی کا باعث بنتا ہے اور دوسروں کے آرام میں خلل ڈالتا ہے۔ گھروں کے گرد درخت لگانے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کافی حد تک باہر سے آنے والا لوگوں اور ٹریفک کا شور دَب جاتا ہے۔" عمر صاحب نے خضر کی بات کو آگے بڑھایا۔

خضر اور گُل کے چہرے پر حیرت نمایاں تھی، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ درخت شور کم کرنے میں بھی مددگار ہو سکتے تھے۔

"اور اَب میں آپ کو پارکوں کا وہ فائدہ بتانے لگا ہوں جو آپ کو اور بھی حیران کر دے گا" عمر صاحب بچوں کی حیرت دیکھ کر بولے، "پارک لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے شہروں میں ہمارا پڑوس کے گھروں میں کوئی خاص آنا جانا نہیں ہوتا، اس طرح سے ہم اپنے پڑوسیوں کو بہتر انداز میں جاننے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ پارکوں میں باقاعدگی سے جانا شروع کر دیتے ہیں، آہستہ آہستہ ان کی آپس میں علیک سلیک ہونا شروع ہو جاتی ہے جو کچھ دنوں میں ہی مکمل واقفیت بلکہ دوستی میں بدل جاتی ہے۔ اس کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ایک دوسرے کے گھریلو حالات سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے، ایک دوسرے کی غمی خوشی کا پتا چلتا ہے، اس میں شریک ہوتے ہیں، ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، بہت سے انفرادی اور مشترکہ مسائل ایک دوسرے کی مشاورت سے یا مل جل کر حل کر لیتے ہیں۔" عمر صاحب نے ایک ہی سانس میں بیان کر دیا۔

خضر اور گُل کو ماننا پڑا کہ پارکوں اور باغوں کی موجودگی سے حاصل ہونے والا یہ فائدہ تو ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہا تھا۔

"اور سنو، بوڑھے لوگوں کو تو خاص طور پر پارک ایک سہارا، ایک آسرا دیتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کے گھر کے باقی افراد تعلیم، نوکری یا دیگر کام کاج میں

مصروف ہونے کے سبب ان کو مناسب وقت نہیں دے پاتے لیکن پارکوں میں یہ بوڑھے لوگ آپس میں مل کر خوش گپیاں لگا لیتے ہیں۔ان کے بہت سے مسائل اور بیماریاں ایک جیسی ہوتی ہیں، ان کے حل پر بھی یہ آپس میں مکالمہ کر لیتے ہیں، ان کے دل کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے" عمر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا، "یہ روزانہ پارکوں میں جانے اور اپنے دوستوں سے ملنے کا انتظار کرتے ہیں اور وہاں سے خوش وخرم لوٹتے ہیں۔یوں کہہ لیجیے پارک ان کو چاق وچوبند رکھتے ہیں، ان کی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔"

یہ نکتہ سن کر بچوں کو پہلی دفعہ یہ احساس بھی ہوا کہ اپنے مشاغل میں کھو کر وہ گھر میں موجود بزرگوں کے ساتھ وقت بتانا اور گفتگو کرنا بھول جاتے ہیں۔

انہوں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ وہ اس پہلو پر بھرپور توجہ دیں گے اور اس کوتاہی پر قابو پائیں گے۔

"آپ نے بتایا تھا ناں کہ پارک بیمار لوگوں کے لیے بھی اچھے ہوتے ہیں۔" خضر نے یاد کروایا۔

"ٹھیک کہا تم نے، بیماروں کی آدھی بیماری تو پارک پہنچ کر ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے۔کھلی فضا اور تازہ ہوا میں ان کی طبیعت بہل جاتی ہے، خاص طور پر ان لوگوں کی جو نفسیاتی عوارض کا شکار ہوتے ہیں۔" عمر صاحب نے وضاحت کی۔

"اچھا! اب میں تم لوگوں کو جوانوں کے لیے بھی پارک کا ایک اور فائدہ بتاتا ہوں" عمر صاحب نے بچوں کو پھر متوجہ کر لیا، "پارک میں جب علاقہ کے نوجوان آتے ہیں، کھیل اور دیگر صحت مندانہ سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں تو تحقیق کے مطابق اس علاقہ میں جرائم کی شرح میں بھی خاطر خواہ کمی آجاتی ہے۔"

اب یہ ایک ایسا فائدہ تھا جو کبھی بچوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

گل اور خضر تو پہلے ہی پارکوں اور باغوں کو پسند کرتے تھے، اُس روز پارک سے واپس آئے تو اُن کی افادیت کے پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو چکے تھے۔

مشق

سوال:

1. پارکوں میں بچوں کی دلچسپی کے کیا کیا مواقع میسّر ہوتے ہیں؟
2. آپ کی نظر میں پارکوں کو موجودہ حالات میں کن تین اہم ترین خطرات یا مسائل کا سامنا ہے؟
3. پارکوں کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے شہریوں پر مشتمل کمیٹیاں کس طرح معاون ہو سکتی ہیں؟
4. پارک لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کس طرح مددگار ثابت ہوتے ہیں، وضاحت سے بیان کیجیے۔
5. ہمارے بڑے اور بزرگ پارکوں سے کس طرح سے مُستفید ہوتے ہیں؟

سکول کا کام

انچارج سکول کی اجازت سے اور احتیاطی تدابیر کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بچوں کو سکول کے قریب کسی بڑے پارک میں لے کر جائیے۔ بچوں کے ساتھ مل کر، جس قدر آسانی سے ممکن ہو، پارک کی صفائی کیجیے۔ اس مقصد کے لیے خصوصی چمٹے خرید کر مستقل طور پر سکول میں رکھوائے بھی جا سکتے ہیں۔ بچوں کو پارک میں گھوم پھر کر اسے درپیش مسائل کی فہرست بنانے کا بھی کہیے، پھر بہتری کی تجاویز پر آپس میں مُکالمہ کروائیے۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیں کہ صبح سویرے یا فارغ اوقات میں قریبی پارک میں جانا شروع کریں، اور اس کے فوائد سے مُستفید ہوں۔ انھیں اپنے بہن، بھائیوں اور دوستوں کو بھی ساتھ لے جانے کا کہیے۔ اگر گھر پر دادا، نانا یا کوئی اور بزرگ باقاعدگی سے پارک جاتے ہیں تو بچے ان کی ہمراہی بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ بچوں کو کہیے کہ وہ پارک جانے والے اپنے بزرگوں سے مکالمہ بھی کریں کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں اور ایسا کرنے سے انھیں کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں اور پھر ان کے جوابات کو کاپی میں تحریر کر کے اپنے ٹیچر کو پیش کریں۔

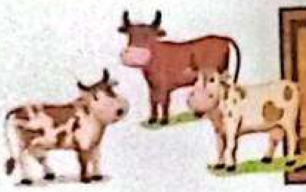

جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک

عمر صاحب کا گھرانا جانوروں کے حوالہ سے بھی بڑا حساس واقع ہوا تھا۔ وہ سب لوگ جانوروں سے محبت کرتے تھے، ان کا ممکنہ حد تک خیال رکھتے تھے اور کبھی کسی جانور کو تکلیف میں دیکھتے تو اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈاکٹر شہناز تو ہر روز یاد سے لان میں ایک سایہ دار جگہ پر چڑیوں اور دیگر پرندوں کے لیے صاف پانی کا کٹورا رکھتی تھیں اور انھیں بچ جانے والے روٹیوں کے ٹکڑے اور دانہ دنکا ڈالتی تھیں۔ اپنے لان میں چہکتے پرندے دیکھ کر ان سب کو بہت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ سے تو پرندے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ ان کی موجودگی میں بھی لان میں اتر آتے تھے۔ بچّے بھی پرندوں کی موجودگی میں احتیاط سے کام لیتے تھے کہ ڈر کر اُڑ نہ جائیں۔ عمر صاحب کو بھی جب موقع ملتا تھا وہ جانوروں کو درپیش مسائل سے اپنے بچّوں کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اگر بازار لے کر جاتے تھے تو مُرغیوں اور گوشت کی دُکان پر اس بات پر سخت افسوس اور غم کا اظہار کرتے تھے کہ بہت سی مُرغیوں کو چھوٹے چھوٹے ڈربوں میں ٹھونسا ہوا ہوتا تھا۔ اکثر پینے والے پانی کا انتظام بھی مناسب نہ ہوتا تھا۔ گرمیوں میں تو مُرغیوں کی حالتِ زار اور بھی قابلِ رحم ہو جاتی تھی جب ایک طرف ان کو گرم موسم کا سامنا ہوتا تھا تو دوسری طرف گرم جسم جانور ہونے کے سبب، ایک دوسرے کے جسم سے نکلنے والی گرمی کو بھی جھیلنا پڑتا تھا۔ اکثر انتہائی نڈھال پڑی رہتی تھیں اور ان میں سے زیادہ تر تو ٹھیک طرح سے اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہ ہو سکتی تھیں۔ عمر صاحب اور ان کے بچّے دُکان والے چاچا کو مُرغیوں کی ان تکالیف کا احساس دلاتے رہتے تھے اور صورتحال بہتر بنانے کی تاکید کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو چاچا ان باتوں کا برا مانتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کو بھی ان معاملات کا ادراک ہونے لگا اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا، وہ مُرغیوں کا خیال رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک روز بچے، عمر صاحب کے ساتھ گوشت لینے گئے تو گُل نے محسوس کیا کہ مُرغیوں کو اپنے سامنے ذبح ہوتے اور پھڑکتے دیکھ کر باقی مُرغیاں بہت ڈری سہمی نظر آ رہی تھیں۔ انھی دنوں گُل کی اسلامیات کی ٹیچر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی سنائی تھی جس کا مفہوم تھا کہ جانوروں کو ایک دوسرے کے سامنے ذبح نہیں کرنا چاہیے۔

’’چاچا آپ کو پتا ہے مُرغیوں کو ایک دوسرے کے سامنے ذبح نہیں کرنا چاہیے۔‘‘ گُل نے چاچا کو مخاطب کر کے کہا۔ چاچا نے غور سے گُل کی جانب دیکھا۔

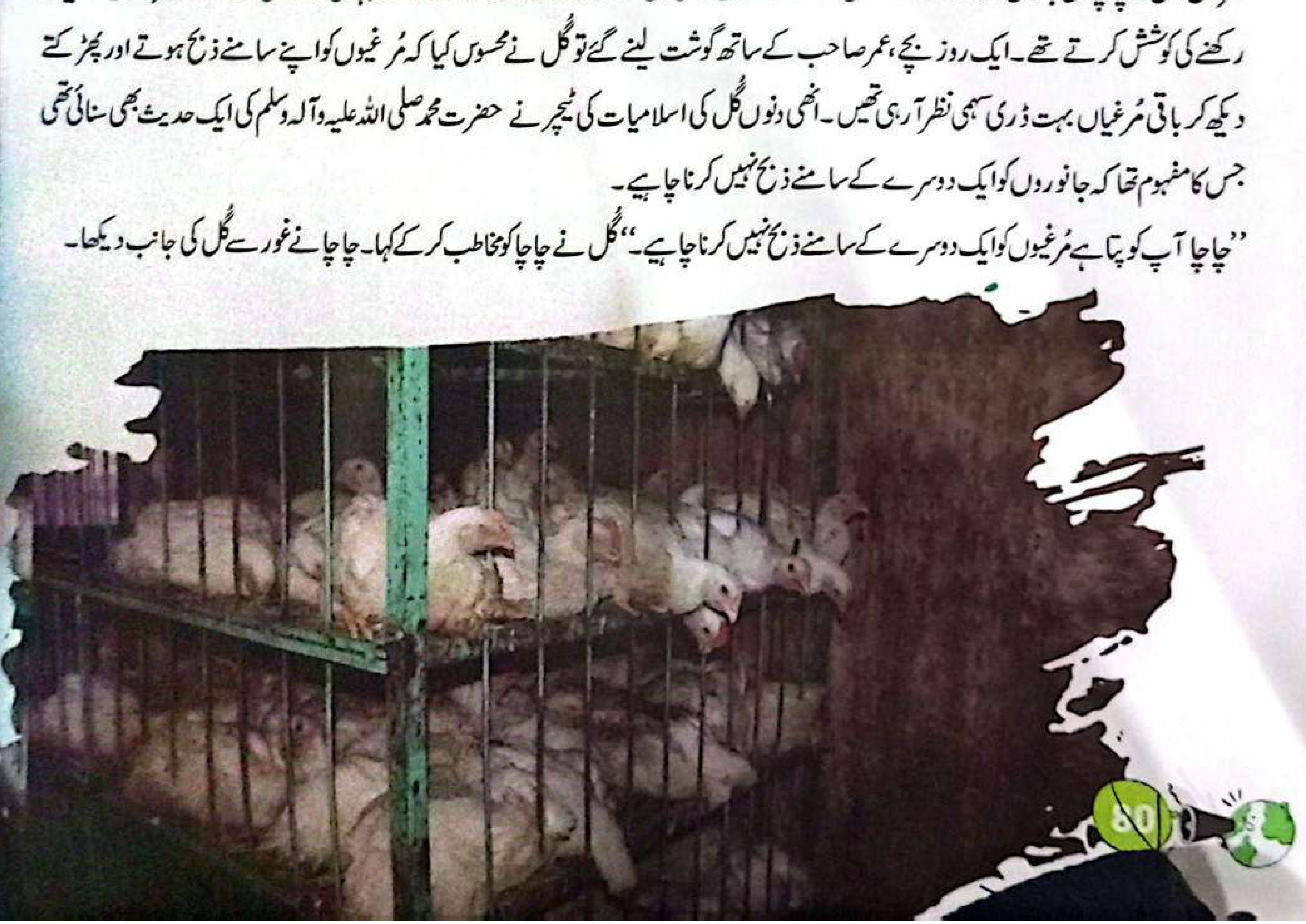

''اور آپ کو پتا ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ہمیں اس سے منع کیا ہے۔'' گُل نے مزید بتایا۔

اس روز کے بعد چاچا نے دُکان کی ایک جانب پردہ ٹانک دیا تاکہ ذبح ہوتی مُرغی، دوسری مُرغیوں کو نظر نہ آئے۔

انھی دنوں عمر صاحب نے فیس بک پر ایک چوہے کی ویڈیو دیکھی جسے کچھ لوگوں نے، تفریح کی غرض سے، ڈوریوں سے باندھ رکھا تھا اور اس سے چھیڑ چھاڑ کر کے بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ فوراً اپنے بچّوں کو وہ ویڈیو دکھا کر ان کے تاثرات جاننا چاہے۔

''ابّو! مجھے بالکل اچھا نہیں لگا، کسی بے زبان کو تکلیف دے کر تفریح کیسی۔'' خضر بولا۔

گُل نے بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی، ''چوہا ہے تو کیا، تکلیف تو محسوس کرتا ہے ناں۔''

''اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی حرکت وہ کر رہے ہیں جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں'' عمر صاحب نے اس معاملے پر گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

عمر صاحب اور ان کے بچّے تو اگر گدھا گاڑی، بیل گاڑی یا گڈّے پر زیادہ سامان بھی لدا دیکھتے تھے تو اس کے مالک کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا کام بس حکمت اور اچھے انداز سے دوسروں کو سمجھانا اور احساس دلانا ہے۔ ہر بار تو نہیں لیکن بہت دفعہ سننے والے لوگ تاسّف اور شرمندگی کا اظہار کرتے اور اس حوالہ سے آئندہ احتیاط برتنے کا وعدہ بھی کرتے تھے۔ گلی کے لڑکے بالے کسی آوارہ کُتّے یا گدھے کو بھی تنگ کرتے نظر آتے تو عمر صاحب ان کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ البتہ اگر کسی وجہ سے دوسروں کو سمجھانا ممکن یا مناسب نہ ہوتا تو کم از کم عمر صاحب اپنے بچوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس عمل کی مذمّت ضرور کرتے تھے۔

جب کبھی وہ لوگ کسی شاہراہ پر سفر کرتے اور ٹرکوں پر لدے مویشی دیکھتے تھے تو بھی عمر صاحب بہت فکر مند ہو جایا کرتے تھے۔ اُنھیں اس بات کی بہت تکلیف ہوتی تھی کہ تنگ جگہوں پر بہت سے جانوروں کو چڑھا کر ان کے سر نیچے کھینچ کر جنگلے سے باندھ دیے جاتے تھے اور اس حالت میں کھڑے کھڑے انھیں کئی کئی گھنٹوں، بلکہ بعض اوقات دنوں کا سفر بھی کرنا پڑتا تھا۔ عمر صاحب اکثر بچّوں کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے کہ ذرا سوچو باقی تکالیف تو ایک طرف، اگر میں تمھارے سر نیچے کھینچ کر اس طرح باندھ دوں کہ تم لوگ اپنی گردن بھی سیدھی نہ کر سکو اور اس حالت میں کھڑے کھڑے تم لوگوں کو کئی گھنٹوں کا سفر کرنا پڑے تو تم لوگوں پر کیا گزرے گی۔ بچوں کو تو یہ سوچ کر ہی جھُرجھری آجاتی تھی۔ وہ عمر صاحب سے اس صورتحال کا حل بھی پوچھتے تھے۔ عمر صاحب کہا کرتے تھے

جہاں جانوروں کے حوالہ سے اور بہت سی قانون سازی کی ضرورت تھی، وہیں ان کی طویل فاصلوں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ آرام دہ منتقلی کے لیے قانون اور ضابطے بنانے کی بھی ضرورت تھی۔ جانوروں کی ترسیل کے لیے ٹرکوں کو مخصوص شکل دینا، جانوروں کی اقسام اور جسامت کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ جانوروں کی حد مقرر کرنا، دورانِ سفر ان کی خوراک اور پانی کا اہتمام کرنا، لمبے سفر کی صورت میں مناسب فاصلوں پر انھیں آرام دلانے اور ستانے کے لیے ٹرک سے اتارنے جیسے اقدامات جانوروں کے سفر کو خاصی حد تک آرام دہ بنا سکتے تھے اور یہ سب کچھ ترقی یافتہ ممالک میں کیا جا رہا تھا۔ عمر صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ ترقی یافتہ دور میں اب گدھا گاڑی، بیل گاڑی اور گڈّے وغیرہ کے متبادل انتظام کیے جانے چاہیے تھے لیکن اگر یہ گاڑیاں ناگزیر ہوں بھی تو جدید تحقیق اور ٹیکنالوجی کی مدد سے، ان کے ڈیزائن اور بناوٹ پر نظرِ ثانی کی ضرورت تھی تاکہ وزن ڈھوتے ہوئے جانوروں کو کم سے کم دشواری اور تکلیف کا سامنا ہو۔

ایک روز ان گھر والوں کا پالتو جانوروں اور پرندوں کی مارکیٹ سے گزر ہوا تو چھوٹے چھوٹے پنجروں میں بند ان کی حالتِ زار دیکھ کر وہ دم بخود ہی رہ گئے۔ یوں تو سب جانوروں اور پرندوں کی حالت قابلِ رحم تھی لیکن بلّی جیسے آزاد منش اور کھلنڈرے جانور کو چھوٹے سے پنجرے میں بند دیکھ کر کہ جس میں کھڑا ہونا تو درکنار، وہ انگڑائی بھی نہ لے سکتی تھی، سب بہت آزردہ ہوئے۔ بلّی پر خود بھی اس قدر پژمُردگی طاری تھی کہ متوجہ کرنے پر بھی آنکھ تک نہ اٹھاتی تھی۔ اس روز وہ لوگ دل پر بہت بوجھ لیے گھر لوٹے۔

بچے اکثر پوچھا کرتے تھے کہ جانوروں کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے کیا ملک میں کوئی قانون موجود نہیں۔ عمر صاحب بتاتے تھے کہ انگریزوں کا بنایا ہوا 1890ء کا ایک قانون موجود ہے۔ اوّل تو اس قدر پرانا ہونے کے سبب وہ بہت سے نئے درپیش آنے والے معاملات کا احاطہ نہیں کرتا، دوسرا اس پرانے قانون کا بھی صحیح معنوں میں اطلاق نہیں کیا جاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جانوروں سے متعلقہ تمام معاملات کو سامنے رکھتے ہوئے اور وسیع تر مشاورت کے ساتھ ایک جامع قانون بنایا جائے، اس کی بھرپور نشر و اشاعت کی جائے، اس کے حوالہ سے عوام الناس میں آگاہی پھیلائی جائے، اور اس کا مکمل اطلاق کیا جائے۔

بچے جانوروں سے محبت کرتے تھے، انھیں دیکھنا اور ان کے بارے میں جاننا بھی چاہتے تھے، لیکن دوسری طرف انھیں چڑیا گھروں میں مُقیّد کرنے کے بھی خلاف تھے۔ وہ اکثر اپنے ابوّ سے اس مسئلہ کا حل بھی پوچھتے تھے۔ عمر صاحب کہا کرتے تھے کہ اس کا بہترین حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم چاروں اطراف میں باڑ لگا کر وسیع و عریض علاقے جانوروں کے لیے مختص کر دیں جہاں وہ قدرتی ماحول میں رہ سکیں۔ وہاں ان کی خوراک، نگہداشت، افزائش اور دیگر معاملات کے لیے ماہرین مقرر کیے جانے چاہییں جو ان اُمور پر گہری نظر رکھیں۔ جہاں تک عوام کے مُستفید ہونے کا تعلق ہے، ایسے علاقے میں مخصوص جگہوں پر رصد گاہیں بنائی جا سکتی ہیں کہ جانوروں کی روز مرہ زندگی میں بھی کسی قسم کی دخل اندازی نہ ہو اور عوام اور محققین مشاہدہ بھی کر سکیں۔ عمر صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ اس سرگرمی پر مناسب ٹکٹ لگا کر ان انتظامات پر اٹھنے والے اخراجات کو بھی پورا کرنے کے لیے مستقل سلسلہ بنایا جا سکتا تھا۔ احتیاطی تدابیر کے ساتھ پیدل یا کسی سواری پر سفاری کا اہتمام بھی کیا جا سکتا تھا۔

اسلام آباد کے بارے میں بھی عمر صاحب کہا کرتے تھے کہ مارگلہ کے پہاڑی سلسلہ میں انسانی دراندازی ختم کر کے اس میں جانوروں کو قدرتی ماحول میں پھلنے پھولنے کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ کہتے تھے: ”میرا خواب ہے کہ مارگلہ روڈ پر سفر کروں تو جنگلے کے اس پار، کسی بھی خوف اور ڈر سے بے نیاز جانوروں کو اٹکھیلیاں کرتے دیکھوں۔“

ان معاملات میں بچے اس قدر حساس ہو چکے تھے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب کبھی گاؤں جاتے اور کسی جانور کو دُھوپ میں بندھا دیکھتے تو بے چین ہو جاتے تھے اور اس کی نشان دہی کرتے تھے۔ اسی طرح جب کبھی چڑیا گھر جانا ہوتا تو جانوروں کو دیکھ کر محظوظ ہونے کے بجائے ان کی حالتِ زار پر کڑھتے تھے۔ اگر چڑیا گھر کے حالات اچھے بھی ہوتے تھے تو بھی بچوں کے لیے یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ جانوروں اور پرندوں کو ان کی مرضی کے برخلاف پنجروں

میں قید کر کے رکھا جائے۔ وہ اس بات پر قلق کا اظہار کرتے تھے کہ چڑیا گھر کے پنجروں اور ان کے اطراف کو اکثر و بیشتر صاف نہ رکھا جاتا تھا۔ ان کو مہیا کی جانے والی خوراک کے معیار پر بھی وہ بہت سوال اٹھاتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ کچھ جگہوں پر اس حوالہ سے فنڈ بھی خُرد بُرد کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات تو جانور دیکھنے میں ہی بیمار نظر آتے تھے لیکن ان کی دیکھ بھال اور طبّی معائنے کا کوئی خاطر خواہ نظام عملی طور پر نظر نہ آتا تھا۔ انھیں اس وقت بہت افسوس ہوتا تھا جب چڑیا گھر میں آنے والے لوگ اور خاص طور پر بچے وہاں پر قید جانوروں کی تکالیف میں اضافے کا سبب بنتے، کنکریاں اور دیگر چیزیں مار کر متوجہ کرنے کی کوشش کرتے یا چھڑیوں، ٹہنیوں وغیرہ سے ٹہوکے دیتے تھے۔ اکثر اپنے کھانے والی چیزیں جانوروں کی جانب اچھال دیتے تھے جنھیں کھا کر ان کے بیمار ہو جانے کا احتمال رہتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو سب دیکھنے والے کم از کم جانوروں کے آرام میں خلل ڈالنے کا سبب تو ضرور بنتے تھے۔

جس بات کی عمر صاحب اور ان کے بچوں کو سب سے زیادہ تکلیف محسوس ہوتی تھی وہ جانوروں کا اکیلا پن تھی۔ اکثر جانور اپنے ہم جنسوں سے الگ، پنجروں میں تنِ تنہا قید ہوتے تھے جو فطرت کے اصولوں کی ایک کُھلی خلاف ورزی تھی، بلکہ ظلم تھا۔ انھی دنوں اسلام آباد مَرغ زار میں مُقیّد 'کاون' نام کے ہاتھی کا میڈیا میں بہت چرچا تھا۔ کاون کو 1985ء میں سری لنکا سے پاکستان لایا گیا تھا۔ 2012ء میں اس کی ساتھی ہتھنی 'سہیلی' کے انتقال کے بعد سے وہ مَرغ زار میں تنہا قید تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، مناسب دیکھ بھال نہ ہونے اور تنہائی کے سبب وہ مختلف جسمانی و نفسیاتی عوارض کا شکار ہو گیا تھا۔ نہ صرف اس کی صحت بہت گر گئی تھی بلکہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو جانے کے سبب وہ ہر وقت اپنے سر کو دائیں سے بائیں بھی ہلاتا رہتا تھا۔ اسے اب عام طور پر زنجیروں سے باندھ کر بھی رکھا جاتا تھا۔ کاون کی صورتحال سے متعلق خبر ملکی میڈیا سے ہوتے ہوئے بین الاقوامی میڈیا تک جا پہنچی۔ جلد ہی دنیا بھر میں وہ 'دنیا کا تنہا ترین ہاتھی' کے نام سے جانا جانے لگا۔ صورتحال کا نوٹس لیتے ہوئے، عدالت عالیہ اسلام آباد نے حکم دیا کہ کاون کو کمبوڈیا میں جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے مختص علاقہ میں دیگر ہاتھیوں کے ساتھ رہنے کے لیے بھجوا دیا جائے۔ گُل اور خضر اپنے بچپن ہی سے جب بھی مَرغ زار جاتے تھے، کاون کو ضرور دیکھنے جاتے تھے۔ وہ اس سے بہت مانوس تھے اور سہیلی کے مر جانے کے بعد کاون کی اذیت ناک صورتحال پر بہت غم بھی محسوس کیا کرتے تھے۔ جب اُنھیں اس بات کی خبر ملی کہ کاون کو کمبوڈیا منتقل کیا جا رہا ہے اور وہ کبھی اسے دوبارہ دیکھ نہیں سکیں گے تو وہ بہت اداس ہو گئے لیکن یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیتے رہے کہ چلو کاون کے حق میں اچھا ہو رہا ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ قدرتی ماحول میں رہ سکے گا۔

جس روز کاون کمبوڈیا منتقل کیا جا رہا تھا وہ سب لوگ اسے خدا حافظ کہنے مَرغ زار گئے۔ جیسے ہی کاون کو لے جانے والا ٹرک ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوا، بچوں کے حوصلے جواب دے گئے اور اُنھوں نے آنسوؤں کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ امی نے دونوں بچوں کو اپنے آپ سے لپٹا لیا اور انہیں تسلی دیتی رہیں، یہ اور بات ہے کہ کاون کو جاتا دیکھ کر ان کی تو اپنی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ عمر صاحب واپسی پر گاڑی چلاتے ہوئے بالکل خاموش تھے۔

گُل پوچھنے لگی: ''ابو! آپ اداس ہیں؟''

''ہاں، بہت اداس ہوں، کاون کے لیے بھی اور اس لیے بھی کہ ہم بائیس کروڑ پاکستانی مل کر بھی ایک ہاتھی کو نہ سنبھال سکے۔ دنیا والے ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے!''

باقی ماندہ سفر سب نے خاموشی سے طے کیا۔

کوئی ہے جو بائیس کروڑ کے اس اِزدِحام میں اک چُوہے کی آواز بنے؟

(ڈاکٹر احتشام انور)

فیس بک پر میں اس ویڈیو کو دیکھ کر دم بخود ہی رہ گیا۔ ڈوریوں کی مدد سے ایک چوہے کو اگلی پچھلی ٹانگوں سے کھینچ کر اس طرح سے لٹکایا گیا تھا کہ اس کا پورا جسم تنا ہوا تھا۔ پسِ منظر میں ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ویڈیو مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں مزدوری کرنے والے کچھ پاکستانیوں نے ریکارڈ کی تھی۔ اُس چُوہے نے غالباً کسی چارجر کے تار کتر دیے تھے، پکڑا گیا تھا اور اب اسے ان صاحبان کے غیظ و غضب کا سامنا تھا۔ اس کا صیاد اسے مسلسل ایک چھڑی سے ٹہوکے دے رہا تھا۔ چُوہے کو اس سے تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن ڈوریوں سے لٹکا وہ ذی روح نہ تو اپنا جسم سمیٹ سکتا تھا نہ ہی بچت کا کوئی اور سامان کر سکتا تھا۔ محض اپنی دُم ہلا رہا تھا یا خوف کے عالم میں چھڑی پر نظر رکھے اس کے ساتھ ساتھ اپنا سر گھما رہا تھا۔ ایک مرحلے پر ان صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ چھڑی سے اس چُوہے کو گدگدی کریں۔ چوہا محظوظ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ہمارے فاضل دوست ضرور ہوئے۔

چُوہے کو اس انداز سے اذیت دینے، اس کا تمسخر اُڑانے سے تو بہتر تھا کہ وہ اسے مار ڈالتے۔ جیسا کہ ہم اکثر دیکھتے اور سنتے آئے ہیں کہ جس گھر کے رہنے والے چُوہوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں، کڑکی کی مدد سے اُسے مار ڈالتے ہیں۔ بلکہ اب تو اس کا استعمال بھی معدوم ہو گیا ہے اور لوگ اس مقصد کے لیے سریع الاثر زہر یا پنجرے کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن ہمارے وہ ہم وطن چُوہے سے چھٹکارا پانے کے بجائے اُسے اذیت دینے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اسے اذیت دینا تو گویا ان کے لیے تفریح کا سامان بنا ہوا تھا۔

اُنھیں اِس چوہے کو اذیت دینے کا حق کس نے ودیعت کیا تھا؟

کیا وہ محض اُسے اس لیے اذیت دے رہے تھے کہ وہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے سے بااختیار تھے، طاقت ور تھے جبکہ چوہا خدا کی بنائی ہوئی مخلوقات میں ان کے تئیں ادنیٰ اور کمزور ترین درجے پر فائز تھا؟ اشرف المخلوقات کی اس راجدھانی میں اس چوہے جیسی ادنیٰ مخلوق کے لیے اب کون آواز اٹھائے گا؟

سنا ہے سوشل میڈیا بڑا بے باک اور بے دھڑک ہو چکا ہے اور ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، تو کیا یار لوگ اس چوہے کے لیے بھی کوئی مہم چلائیں گے کیا؟

اس مرحلے پر مہم چلانے کا مقصد یقیناً اس چُوہے کی تکلیف کا ازالہ کرنا نہیں بلکہ اس حوالے سے شعور کو پھیلانا ہوگا کہ جانور بھی ذی روح ہونے کے ناتے تکلیف محسوس کرتے ہیں، اور ان سے رحم دلی کا معاملہ روا رکھنا چاہیے۔ اس مہم کا یہ بھی مقصد ہوگا کہ اس انتہائی ناخوش گوار واقعے میں ملوث افراد کو سزا نہیں تو کم از کم بے نقاب ضرور کیا جائے تا کہ وہ اور ان جیسے دوسرے آئندہ ایسی حرکت کا ارتکاب کرنے سے پہلے سوچنے پر مجبور ہو جائیں اور اگر کر بیٹھیں تو منہ چھپاتے پھریں۔ ملک میں رائج 1890ء کے ایک قانون کے تحت کہ جو خود بھی توجہ کا طالب ہے، جانوروں پر ظلم کرنا جرم ہے، اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو ایک ماہ تک قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ تو کیا اب اس جرم کے ارتکاب کے بعد ہمارے تحقیقاتی ادارے اس بات کا کھوج لگانا پسند کریں گے کہ یہ کون لوگ تھے اور انھیں دوسرے ملک کے اداروں کے ساتھ مل کر قانون کے کٹہرے میں لایا جائے؟ کیا ہماری عدالتیں جو بات بے بات اَز خود نوٹس لے لیتی ہیں، خدا کی دوسری مخلوقات کو بھی اس قابل سمجھتی ہیں کہ ان کے حقوق کا بھی تحفظ کریں اور اس جرم کے ارتکاب پر بھی حرکت میں آئیں؟

اقوامِ عالم میں اگر اب بھی ہماری کوئی ساکھ ہے تو کیا کسی کو اس بات کی بھی تکلیف ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے ہمارے ہم وطنوں کی اس حرکت نے پوری قوم کی ساکھ کو مجروح کیا ہے اور ہمارے لیے شرمندگی کا باعث بنی ہے؟ کیا کوئی لکھاری، کوئی دانش ور، کوئی اینکر پرسن، کوئی ادارہ اس معاملے پر آواز اٹھائے گا جو بظاہر تو غیر اہم ہے لیکن ہماری اجتماعی فطرت کا عکاس ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی سخت دل بھی ہیں اور تماش بین بھی؟ کچھ احباب چھوٹتے ہی یہ بھی کہہ اٹھیں گے کہ یہاں انسانوں کو بنیادی حقوق نہیں ملتے اور ہم جانوروں کا، اور وہ بھی کسی اور کا نہیں بلکہ چُوہوں کا رونا لیے بیٹھے ہیں، اور اس کے لیے آواز اٹھانے کی دہائی دے رہے ہیں۔ بعض دوست تو پھبتی بھی کسیں گے۔

بصد احترام عرض ہے کہ کیا جب تک انسانوں کو ان کے حقوق نہیں مل جاتے، ہمیں جانوروں پر ہونے والے مظالم نہیں روکنے چاہییں؟ ان کی نشان دہی، ان کا تدارک نہیں کرنا چاہیے؟ چلیں میں تو شاید کچھ غلط ہی کہتا ہوں گا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ احکامات سناؤں آپ کو؟ فرماتے ہیں ایک چڑیا تک کو بلا ضرورت مت مارو۔ ایک سفر کے دوران ایک پرندے کے بچے خود گھونسلے میں واپس رکھوائے۔ جانوروں کو داغنے سے بھی روکتے تھے آپؐ۔ وہ واقعہ بھی کسی نہ کسی شکل میں پڑھنے والوں نے سُن رکھا ہوگا کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طوائف کے حوالے سے جنت کی بشارت دی تھی کہ جس نے ایک پیاسے کتے کو انتہائی تردد سے کنویں میں سے پانی نکال کر پلایا تھا۔ اُس عورت کے حوالے سے جہنم کی پیش گوئی بھی سنی ہوگی آپ نے کہ جس نے ایک بلّی کو باندھ کر رکھا تھا اور وہ اُسی حالت میں بھوکی پیاسی مر گئی تھی۔ اُس اونٹ کی بابت بھی سن رکھا ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر بلبلا اٹھا تھا اور آپؐ نے اس کے مالک کو بلا کر سرزنش کی تھی کہ وہ اس کی بساط سے بڑھ کر کام لیتا ہے اور ضرورت سے کم کھانے کو دیتا ہے۔ آپؐ تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ جانور ذبح کرتے ہوئے چھری تیز رکھو تا کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ اور تو اور ایک روایت میں آپؐ نے چیونٹیوں کو جلا کر مارنے والوں کی باز پُرس بھی کی۔ سچ ہے آپؐ رحمت اللعالمین ہیں، سارے جہانوں کے لیے رحمت، ان میں بسنے والی اور موجود ہر شے، ہر تخلیق کے لیے رحمت۔ یہ تو ہم بدنصیبوں نے ان کی تعلیمات کو اگر یکسر فراموش نہیں تو کم از کم بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور ہمارے اعمال کے سبب اسلام کا اصل چہرہ دُھندلا گیا ہے، کہیں گم ہو گیا ہے!

اور پھر اسلام ہی کیا، تمام مذاہبِ عالم جانوروں سے محبت اور رحم دلی کا درس دیتے ہیں۔ مذاہب کو بھی چھوڑیے انسانیت کا، اخلاقیات کا بھی تو یہی تقاضا ہے۔

اس معاملے میں تو بات چُوہے تک ہی محدود نہیں بلکہ جیسے کہا گیا یہ ہماری اجتماعی فطرت کا آئینہ دار ہے۔ اس چُوہے کو لمحے بھر کو فراموش کر دیتے ہیں، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ گدھے جیسے بے ضرر اور فائدہ رساں جانور کے ساتھ وطنِ عزیز میں کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے؟ کیا آپ نے یہ منظر نہیں دیکھ رکھا کہ ریڑھی پر لدے وزن کے سبب گدھا ہوا میں مُعلّق ہو گیا ہو؟ سڑکوں پر رواں ان ٹرکوں اور ٹرالیوں پر بھی کبھی نظر نہیں پڑی جن پر مویشیوں اور دیگر جانوروں کو وہ جو کہا جاتا ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک شہر سے دوسرے شہر، حتیٰ کہ ڈیورنڈ لائن کے اُس پار لے جایا جاتا ہے؟ اگر آپ کی گردن میں ایک رسّی ڈال کر اسے کھینچ کر جنگلے کے ساتھ اس طرح سے باندھ دیا جائے کہ آپ کا سر اور گردن مستقل جھکی رہے اور آپ اسے سیدھا نہ کر سکیں، اور پھر اس عالم میں کسی تنگ جگہ کھڑے کھڑے آپ کو دنوں کا نہیں تو کم از کم گھنٹوں کا سفر کرنا پڑے تو آپ پر کیا گزرے گی؟ آپ پر جو گزرے گی سو گزرے گی جس وقت آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے اس وقت بھی لاکھوں نہیں تو ہزاروں مویشی اس تکلیف سے گزر رہے ہوں گے!

چلیں ان کا ذکر بھی چھوڑ دیتے ہیں، شدید گرم موسم میں، چھوٹے چھوٹے پنجروں میں لاتعداد مُرغیاں تو ٹھنسی ہوئی دیکھی ہوں گی، جو بعد ازاں اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں اور اسی حالت میں ذبح کر دی جاتی ہیں؟ اِس سے یاد آیا آپ نے ایک جانور کو دوسرے کے سامنے ذبح ہوتے اور تڑپ تڑپ کر جان دیتے تو دیکھا ہوگا؟ اور نہیں تو عیدِ قرباں کے دن؟ اور کیا کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ اس موقع پر دیکھنے والے جانوروں کی کس طرح سٹی گم ہوئی ہوتی ہے؟ کس قدر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ اپنے ساتھی کو تڑپتے اور مرتے دیکھ رہے ہوتے ہیں؟ گلی کے بچوں کو آوارہ کتے بلیوں کے گلے میں رسّی ڈال کر کھینچتے یا انھیں پتھر مارتے تو دیکھا ہوگا؟ سخت دھوپ میں کِلے سے بندھے مویشیوں پر تو کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی جگہ نظر پڑی ہوگی؟ چڑیا گھر کے شیروں کو بھیڑوں سے بھی کمزور تو محسوس کیا ہوگا آپ نے؟ اور پھر بھی آپ یہ سوچتے ہیں کہ اس چُوہے کو دَرپیش معاملہ اپنی نوعیت کا ایک عام سا واقعہ ہے اور اس قدر بحث اور توجہ کا طالب نہیں!

چھوڑیے صاحب! میں کس بات کا رونا لے بیٹھا، آپ بتائیے پی ایس ایل کے میچ کیسے رہے؟

الیکشن وقت پر ہو رہے ہیں یا نہیں؟

کون سی پارٹی جیتتی نظر آ رہی ہے؟ موسم کی سنائیں؟

بشکریہ 'ہم سب'

www.humsub.com.pk/author/ehtasham-anwar/

مشق

سوال:

1. فروخت کے لیے لائی جانے والی مرغیوں کو دکانوں پر کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
2. ترسیل کے دوران مویشیوں کو کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے؟ ان کا تدارک کیونکر ممکن ہے؟
3. چڑیا گھر میں رکھے جانے والے جانوروں کو کس صورتحال کا سامنا ہوتا ہے؟ وضاحت سے بیان کیجیے۔
4. 'کاون' نامی ہاتھی کی نگہداشت میں ہم سے کیا کیا خامیاں رہ گئی تھیں؟ اس واقعہ نے دنیا میں ہمارے بارے میں کیسا تاثر قائم کیا ہوگا؟ ایسی صورتحال سے نپٹنے کے لیے ہمیں آئندہ کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟
5. اپنے اطراف کا جائزہ لیجیے، کم از کم پانچ جانوروں کے نام اور ان کو لاحق مشکلات/ مسائل قلم بند کیجیے۔

عملی کام

سکول کا کام

ایک طرف جانوروں کی زندگی کو سمجھنا بھی انسان کے لیے علمی اور عملی طور پر ضروری ہے تو دوسری طرف جانوروں کو مقید رکھنا بھی غیر مناسب ہے۔ بچوں کے ساتھ مکالمہ کیجیے کہ اس صورتحال کے کیا کیا حل ممکن ہیں اور ان کے بتائے ہوئے حل ان سے کاپی میں نوٹ کروائیں۔ بچوں سے تحریری طور پر یہ آرا بھی طلب کیجیے کہ ایک چڑیا گھر کو کس طرح کا ہونا چاہیے۔

گھر کا کام

بچوں کو کہیے، اپنے گھر کے کسی بڑے کے ساتھ قریبی مارکیٹ میں مرغیوں اور گوشت فروخت کرنے والی دکان پر جائیں اور دیکھیں وہاں مرغیوں کو کن حالات کا سامنا ہے۔ انھیں یہ بھی کہیں کہ دکان کے مالک کے ساتھ مدلل لیکن انتہائی مہذب انداز میں اس حوالہ سے مکالمہ بھی کریں اور بہتری کے لیے تجاویز دیں۔ بچے اس سرگرمی کی روداد کو کاپی میں نوٹ کریں اور سکول میں ٹیچر کو چیک کروائیں۔

گاؤں کی سیر (۱)

بچے ہمیشہ کی طرح گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے دادا ابّا اور دادی اماں کے پاس گاؤں پہنچ گئے۔ انھیں اپنے رشتہ دار، دوست احباب، گاؤں کا ماحول اور اس کی زندگی، سب بہت پسند تھے اور وہ اپنی چھٹیاں خوب مزے سے گزارا کرتے تھے۔ انھیں یہاں سیکھنے کے بھی بہت سے مواقع ملتے تھے۔ دادا ابّا کسان تو تھے ہی، ساتھ ہی ساتھ درختوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ اپنے گھر کے ویہڑے میں اور ڈیرے پر کئی طرح کے پھل دار اور سایہ دار درخت لگا رکھے تھے۔ وہ بچوں کو بھی ان درختوں سے متعارف کرواتے رہتے تھے۔ گاؤں میں دیگر جگہوں پر بھی اسی طرح کے درخت لگے ہوئے تھے۔ دادا ابّا کے گھر کے بیچوں بیچ دھریک کا ایک پرانا درخت لگا ہوا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ جلدی بڑا ہو جاتا ہے اور سایہ بھی خوب دیتا ہے، اس لیے ویہڑے میں لگا رکھا تھا۔ جب بچے چھٹیاں گزارنے آتے تھے تو دادا ابّا یاد سے اس پر پینگ بھی ڈلوا دیا کرتے تھے۔ یہ درخت سارا سال ہرا بھرا رہا کرتا تھا البتہ اس پر کوئی پھل نہیں لگتا تھا۔ دادا ابّا بتایا کرتے تھے کہ انگریز کے زمانے میں سڑکوں اور نہروں کے کناروں پر زیادہ تر یہی درخت لگائے جاتے تھے۔

ویہڑے کی ایک جانب کیکر کا درخت لگا ہوا تھا۔ یہ بھی دھریک کی طرح ایک درمیانی قد وقامت کا درخت تھا۔ پھل اس پر بھی کوئی نہیں لگتا تھا البتہ کانٹے بہت تھے۔ دادا ابّا کبھی موج میں ہوتے تو بچوں کو پنجابی کے مشہور صوفی شاعر، میاں محمد بخش کا شعر بھی تحت اللفظ میں خوب سنایا کرتے تھے:

نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نئیں پایا
کیکر تے انگور چڑھایا ، ہر گچھا زخمایا

بچوں کو پہلے پہل تو اس شعر کی سمجھ نہ آتی تھی پھر دادا ابّا کہا کرتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔

دادا ابّا نے یہ بھی بتایا کہ ویسے تو مسواک حاصل کرنے کے لیے پیلو کا درخت سب سے زیادہ موزوں تصور کیا جاتا ہے لیکن کیکر کی مسواک بھی خاصی کارآمد ہوتی ہے۔ عمر صاحب بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے اور اردو کی ایک مشہور کتاب 'شہاب نامہ' کا حوالہ دیتے ہوئے بچوں کو بتانے لگے کہ پاکستان کی آزادی کے بعد ملکی وسائل اس قدر محدود تھے کہ دفتری اُمور کے لیے کامن پن کی جگہ بھی کیکر کے کانٹے استعمال کرنا پڑتے تھے۔

گاؤں کے بیچوں بیچ ایک برگد کا درخت تھا۔ دادا ابّا کے بقول یہ کوئی تین سو سال پرانا تھا۔ وہ اونچا تو بہت نہیں تھا البتہ اطراف میں کافی پھیلا ہوا تھا۔ اپنی عمر کی مناسبت سے اس کا تنا بھی خاصا موٹا تھا۔ اس کی کچھ شاخیں رسیوں کی طرح لٹک کر اب زمین تک بھی پہنچی ہوئی تھیں۔ اس کا سایہ انتہائی گھنا تھا۔ اس کے نیچے ہر وقت ایک دنیا آباد رہتی تھی۔ ایک طرف لڑکے بالے گلی ڈنڈا کھیل رہے ہوتے تھے تو دوسری طرف لڑکیوں نے بھی پینگ ڈال رکھی تھی۔ اور تو اور گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی چارپائیاں بچھائے، تکیوں سے ٹیک لگائے، خوش گپیوں میں مشغول رہتے تھے۔ دادا ابّا کہا

کرتے تھے، اس درخت نے سارے گاؤں کو ایک دھاگے میں باندھ رکھا تھا، ایک لڑی میں پُرو رکھا تھا۔ اپنی ہر خوشی غمی میں گاؤں کے لوگ اسی کے سائے تلے اکٹھے ہوتے تھے۔ جس روز یہ درخت کٹ گیا، سمجھو گاؤں کا شیرازہ ہی بکھر جائے گا۔

اپنے ڈیرے پر دادا ابا نے دیگر درختوں کے ساتھ ساتھ پیپل اور شیشم کے درخت بھی لگا رکھے تھے۔ پیپل کے درخت بہت پھیل چکے تھے اور دادا ابا بتاتے تھے کہ یہ ان کے والد نے اپنی جوانی کے دنوں میں لگائے تھے۔ زیادہ تر جانور انھی کے سائے میں بندھے ہوئے ہوتے تھے۔ پیپل کے درخت اونچے اور گھنے ہونے کی وجہ سے گہری چھاؤں دیتے تھے ''تمھیں پتا ہے گوتم بدھ کون تھے؟'' دادا ابا ایک دن پوچھنے لگے۔

''مجھے پتا ہے، وہ بدھ مت مذہب کے بانی تھے۔'' خضر نے جواب دیا۔

''ان سے منسوب کوئی خاص بات؟'' دادا ابا نے اگلا سوال کیا۔

''مجھے یاد پڑتا ہے وہ کسی درخت کے نیچے کافی عرصہ بیٹھے رہے تھے۔'' خضر نے پھر جواب دیا۔

''ٹھیک کہا تم نے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حقیقت کو پانے کے لیے، ایک درخت کے نیچے ایک لمبا عرصہ مراقبہ کیا تھا۔'' دادا ابا نے بتایا۔

''تو کیا وہ پیپل کا ہی درخت تھا؟'' گُل بھانپ کر بولی۔

''جی بالکل، اسی لیے بدھ مت کے نزدیک یہ بڑا مقدس درخت تصور کیا جاتا ہے۔'' دادا ابا نے مزید بتایا۔

دادا ابا کے ڈیرے پر شیشم کے درختوں کی تعداد وقت کے ساتھ ساتھ اب کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دادا ابا اکثر افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ ان کے وقتوں کا مقبول ترین درخت اب بیماریوں کے سبب خال خال ہی نظر آتا تھا۔ اس کی لکڑی مضبوط ہوتی ہے اور فرنیچر بنانے کے کام آتی ہے۔ شاید اس وجہ سے بھی یہ درخت اب کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔

دادا ابا نے ایک شام بچّوں سے وعدہ کیا کہ میں کل صُبح ڈیرے لے جا کر تمھیں دو ایسے پھل کھلاؤں گا جو شاید تم نے شہر میں نہ کھائے ہوں۔ خضر اور گُل اگلے روز خوشی خوشی دادا ابا کے ساتھ ہو لیے۔ دادا ابا پہلے انھیں ایک بڑے درخت کی طرف لے کر گئے جو اونچا تو بہت تھا لیکن اطراف میں بہت زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا۔ اس کا پھل واقعتاً بچوں نے پہلے نہیں کھا رکھا تھا۔

''اس کا نام پتا ہے تم دونوں کو؟'' دادا ابا کے اس سوال پر خضر اور گُل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا اس کا رنگ تو بتا دو؟'' دادا ابا نے اگلا سوال کیا۔

''جامنی!'' گُل جھٹ سے بولی۔

''جامنی کا پتا ہے پر جامن کا نہیں۔'' دادا ابا ہنس پڑے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جامن کا درخت زیادہ تر پھل برسات کے دنوں میں دیتا ہے۔

''اس کے پھل کی ایک اور خاص بات بھی ہے'' دادا ابا نے مزید بتایا،''وہ ایک بیماری ہوتی ہے ناں ذیابیطس جس میں خون میں شکر کی سطح خاصی بڑھ جاتی ہے، اس میں بھی جامن خاصا فائدہ دیتا ہے۔''

بیری کے درخت کا پھل بھی خضر اور گُل کو خاصا پسند آیا۔ یہ درخت بہت بڑے تو نہ تھے البتہ دو اقسام کے تھے۔ ایک کا پھل گول اور انگور سے ذرا بڑی جسامت کا تھا جبکہ دوسرے کا پھل قدرے لمبا تھا۔ بیر پوری طرح پکنے میں ابھی البتہ کچھ دن باقی تھے۔

دادا ابا نے اپنے کھیتوں کی اس جانب جہاں قریب سے نہر گزرتی تھی، سفیدے کے درخت لگا رکھے تھے۔ بتانے لگے اس زمین کا سیم سے متاثر ہونے کا خطرہ تھا، اس لیے وہاں سفیدہ لگا رکھا تھا جو تیزی سے اُگتا اور پانی کو بھی زیادہ جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ سفیدے کے درخت اونچے اور ان کے تنے اور شاخیں نسبتاً سفیدی مائل تھیں۔ دادا ابا نے یہ بھی بتایا کہ اس کی لکڑی نرم ہوتی ہے اور کاغذ، لکڑی کے کریٹ اور ماچس کی تیلیاں بنانے کے کام آتی ہے۔ دادا ابا کہا کرتے تھے ہمارے بڑے نسلوں کا بھلا سوچا کرتے تھے اور کیکر، شیشم، پیپل اور برگد جیسے درخت لگایا کرتے تھے اور آج کے لوگ سفیدے کی طرف بھاگتے ہیں کہ محض چند سالوں میں ہی تیار ہو جاتا ہے اور ان کے اپنے کام آ جاتا ہے۔

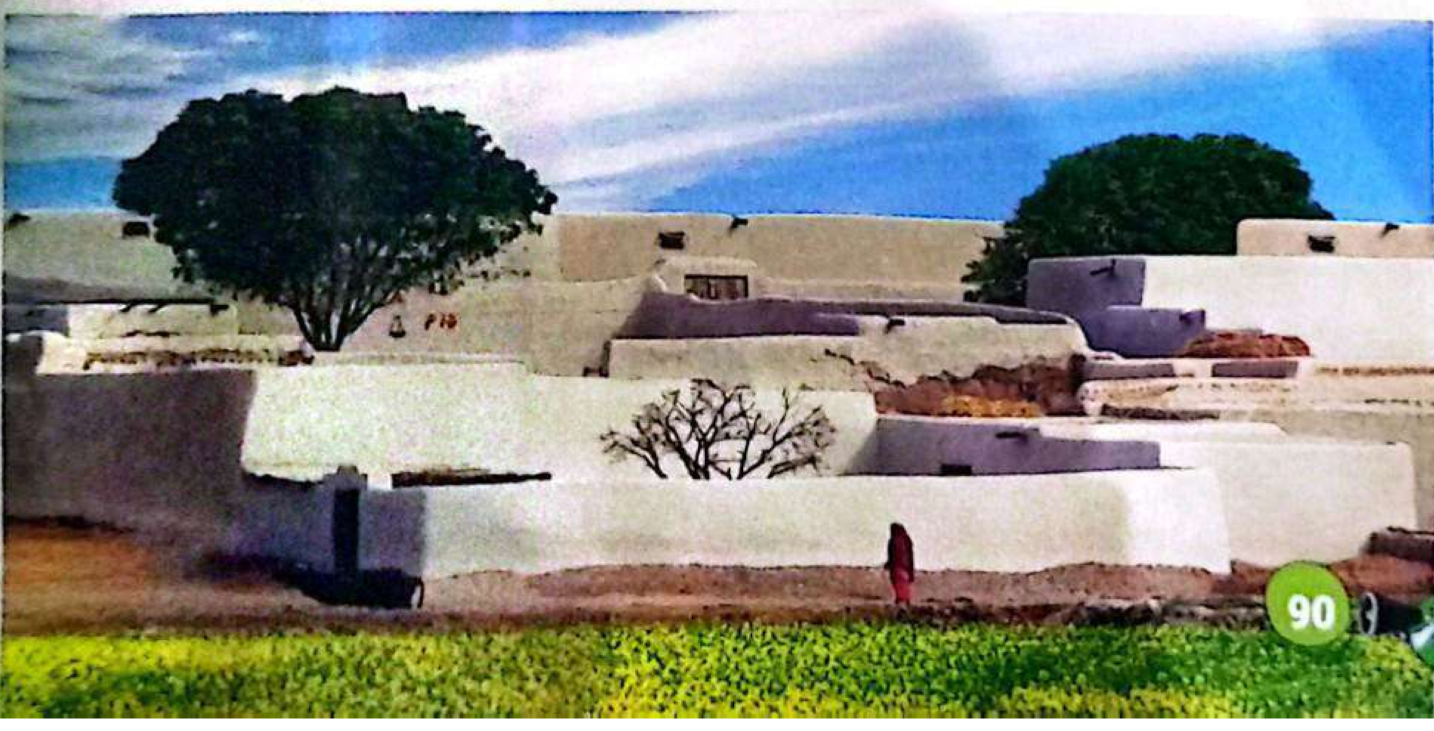

کیکر

پیپل

جامن

بیری

سفیدہ

مشق

سوال:

1. سبق میں دیے گئے کوئی سے پانچ درختوں کے نام بتائیے اور ان کی ایک ایک خصوصیت بیان کریں۔
2. آپ کی رائے میں سڑکوں کے کناروں پر کن خوبیوں کے حامل درخت لگانے چاہییں؟
3. بدھ مت کے پیروکاروں کے نزدیک کون سا درخت مقدس جانا جاتا ہے اور کیوں؟
4. جامن کا پھل انسانی صحت کے لیے کس طرح مفید ہے؟
5. سیم زدہ زمین پر کون سے درخت لگائے جا سکتے ہیں؟ اس کی وجہ بھی بیان کریں۔

عملی کام

سکول کا کام

بچوں کو سکول میں لگے تمام درختوں سے متعارف کروائیے۔ ایک رجسٹر مرتب کریں جس میں تمام درختوں کے نام، مقام، اونچائی اور امکانی عمر لکھیے۔ اگر کوئی درخت کسی بیماری کا شکار ہے تو انچارج سکول کو کہہ کر محکمہ زراعت یا محکمہ جنگلات سے اس کا معائنہ کروائیے اور اس کا علاج اور مناسب دیکھ بھال کیجیے۔ اس حوالہ سے بھی معلومات کا اندراج رجسٹر میں کریں۔ اپنی کلاس کے بچوں کو اس سارے عمل میں شریک رکھیں۔ مزید یہ کہ محکمہ جنگلات سے موزوں درخت حاصل کیجیے اور سکول میں مناسب جگہوں پر لگوائیے۔ اس مقصد کے لیے جہاں تک ممکن ہو، پھل دار درختوں کو ترجیح دیں۔

گھر کا کام

کسی مناسب وقت، قریبی پارک جائیں اور درختوں کے بارے میں سوجھ بوجھ رکھنے والے کسی بڑے یا وہاں متعین کسی مالی سے پارک کے درختوں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔ ان درختوں کے نام اور خصوصیات کاپی میں نوٹ کر کے ٹیچر کو چیک کروائیں۔

گاؤں کی سیر (۲)

اگلے روز بچے بہت خوش تھے کہ دادا ابّا کے ساتھ اُنھوں نے ڈیرے پر جانا تھا جہاں چاول کی بیجائی شروع ہونا تھی۔ ڈیرے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں، کھیتوں میں پانی کھڑا تھا اور بہت سے لوگ قمیصیں اتارے، شلواروں اور تہبندوں کو اوپر کیے، پانی میں چھوٹے چھوٹے پودے لگا رہے تھے۔

دادا ابّا بتانے لگے یہ لوگ دھان یعنی چاول کی پنیری کو کھیتوں میں منتقل کر رہے تھے۔

''پنیری کیسے تیار کی جاتی ہے؟'' خضر سے پہلے ہی گُل بول اٹھی۔

''بھئی، مئی کے وسط سے جون کے وسط تک عموماً دھان کے بیج زمین کے ایک قطعہ میں بو دیے جاتے ہیں۔ مہینے ڈیڑھ بعد جب چھوٹے پودے تیار ہو جاتے ہیں تو انھیں بڑے بڑے کھیتوں میں، کھڑے پانی میں، ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر لگا دیا جاتا ہے، جیسا کہ ابھی کیا جا رہا ہے۔'' دادا ابّا نے تفصیل سے بتایا۔

بچے دلچسپی سے کھیت میں کام کرنے والے افراد کو پنیری لگاتے دیکھنے لگے۔ دادا ابّا سے پوچھنے لگے: ''ہم بھی پودے لگا سکتے ہیں؟''

دادا ابّا پہلے تو کہنے لگے کہ اس گرم اور حبس زدہ موسم میں ایسا کرنا بہت مشکل ہے لیکن پھر بچّوں کا شوق دیکھ کر مان گئے۔

وہ کام بچّوں کی توقع سے زیادہ مشکل نکلا۔ ایک تو آسمان پر سورج چمک رہا تھا، سخت گرمی تھی، ہوا نہ چلنے کے سبب بھی حبس محسوس ہو رہا تھا، اور دوسرا، گرم کھڑے پانی میں سے اُٹھنے والے بخارات کی وجہ سے بھی حبس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سر پر تو بچوں نے کپڑے باندھ ہی رکھے تھے، کمر بھی تپتی دھوپ میں جلنے لگی۔ اور پھر جھک کر پودے لگاتے رہنا اور بھی مشکل کام تھا۔ ان کی ہمت جلد ہی جواب دے گئی اور وہ باہر آ گئے۔ دادا ابّا کو کہنے لگے انھیں اب صحیح معنوں میں احساس ہوا ہے کہ کسانوں کا کام کتنا مشکل اور محنت طلب ہوتا ہے، اور وہ اب ان کی پہلے سے بھی زیادہ عزت کریں گے۔

بچّوں نے چلتے ٹیوب ویل پر نہا کر اپنی گرمی کچھ کم کی۔ ٹیوب ویل پر نہانے کا تجربہ بچوں کو پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ انھیں اس قدر مزا آیا کہ بیان سے باہر تھا۔ دادا ابّا اُن کے والد کو بتا رہے تھے کہ چونکہ اب موسمیاتی تبدیلی کے سبب بارشیں غیر یقینی اور کم ہوتی تھیں اور نہری پانی بھی گھٹتا چلا جا رہا تھا، اُنھیں دھان کی فصل کے لیے ٹیوب ویل زیادہ چلانا پڑتا تھا جس کی وجہ سے ڈیزل کی کھپت اور خرچہ میں بہت اضافہ ہو رہا تھا۔ عمر صاحب البتہ اپنے والد کو بتانے لگے کہ اب جدید سائنسی طریقوں کو اپنا کر کم پانی کے استعمال سے بھی دھان کی فصل اُگائی جا سکتی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس حوالہ سے حکومت کو بھی کسانوں کی تربیت اور ضروری سہولیات کی فراہمی پر توجہ دینی چاہیے اور کسانوں کو خود بھی معلومات حاصل کر کے نئی سائنسی تحقیق اور طریقوں سے مُستفید ہونا چاہیے۔

دادا ابّا نے بتایا دھان کی فصل اکتوبر، نومبر کے مہینوں تک تیار ہو جائے گی۔ بچّے پوچھنے لگے اس کے بعد کیا اُگائیں گے؟

''ہم پھر یہاں پر سونا اُگائیں گے۔'' دادا ابّا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سونا؟'' دونوں بچّے حیران ہو گئے۔

''جی جناب سونا! گندم کی فصل ہمارے لیے سونا ہی تو ہوتی ہے، خوشحالی لاتی ہے، ہم اسے کھاتے بھی ہیں، بیچتے بھی ہیں۔ اور پھر گندم کی رنگت بھی تو سونے جیسی ہوتی ہے۔'' دادا ابّا نے وضاحت کی۔

''گندم کتنی دیر میں تیار ہو جاتی ہے؟'' خضر نے پوچھا۔

''اپریل، مئی کے مہینوں میں گندم پک کر کٹائی کے لیے تیار ہو چکی ہوتی ہے۔'' دادا ابّا نے جواب دیا۔

"اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ کس فصل کو زمین کی چاندی بھی کہتے ہیں؟" دادا ابّا نے پوچھا۔

بچے اس کا جواب نہ دے پائے۔

"چلو میں بتاتا ہوں، کپاس کا پھول چونکہ سفید رنگ کا ہوتا ہے اور فصل بھی مہنگی بکتی ہے اس لیے اسے زمین کی چاندی بھی کہا جاتا ہے۔" دادا ابّا نے بتایا۔

"ان کو یہ بھی تو بتائیے کہ کپاس سے دھاگا اور کپڑا بنتا ہے اور ہم اس سے بہت سا زرِمبادلہ بھی کماتے ہیں۔" عمر صاحب نے لُقمہ دیا۔

"ہاں بھئی، ہم دُنیا میں سب سے زیادہ کپاس پیدا کرنے اور برآمد کرنے والے ممالک میں شامل ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے شامل تھے" دادا ابّا کے لہجے میں تاسف نمایاں ہوگیا، "اور اب عالم یہ ہے کہ ہمیں اپنی ضروریات بھی پوری کرنے کے لیے کپاس باہر سے منگوانا پڑتی ہے۔"

"کیوں ایسا کیا ہوگیا؟" بچے تشویش میں مبتلا ہوگئے۔

"بدقسمتی سے کپاس کی بہتر اقسام اور زیادہ پیداوار پانے کے لیے ملک میں اس درجہ کی تحقیق نہیں ہو رہی جو اپنی ضروریات پوری کرنے اور دنیا کے دیگر ممالک کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ پھر بیماری اور کیڑوں نے بھی اس فصل کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ رہی سہی کسر جراثیم کُش اور کیڑے مار ادویات کے گرتے ہوئے معیار اور ان کے بے جا اور بے دریغ استعمال نے پوری کر دی ہے۔ جراثیموں اور نقصان دہ کیڑوں میں مدافعت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کوئی دوا اب ان پر اثر ہی نہیں کرتی۔" دادا ابّا نے تفصیل سے بتایا۔

"بالکل اسی طرح ناں، جس طرح ہماری ٹیچر بتاتی ہیں کہ انسانوں میں اینٹی بائیوٹک دواؤں کے بے جا استعمال سے بیماریاں پھیلانے والے جراثیموں میں مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔" خضر نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"جی بالکل، ٹھیک سمجھے آپ" دادا ابّا نے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے، "گنّے کی کاشت نے بھی کپاس کی پیداوار کو متاثر کیا ہے۔"

"وہ کس طرح دادا ابّا؟" گُل حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"بھئی آبادی کے ساتھ ساتھ چینی کی کھپت بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے، جس کو پورا کرنے کے لیے نئی سے نئی شوگر ملیں لگتی چلی جا رہی ہیں۔ چونکہ گنّے

کی فصل کاشت کرنے میں کسان کی محنت بھی کم لگتی ہے اور پیسے بھی جلد اور اچھے مل جاتے ہیں، سو اب بعض مقامات پر وہ گنا کاشت کرنے کو کپاس لگانے پر ترجیح دینے لگا ہے۔'' دادا ابا نے وضاحت کی۔

''اچھا کوئی مجھے یہ بتائے، پاکستان کا قومی مشروب کون سا ہے؟'' دادا ابا نے موضوع بدلتے ہوئے بچوں سے سوال کیا۔

''لسی۔'' خضر نے جھٹ سے کہا۔

''اندازہ تو خوب لگایا ہے، لیکن لسی نہیں۔'' دادا ابا ہنس کر بولے۔

''میں بتاؤں'' عمر صاحب نے بیچ میں لقمہ دیا، ''گنے کا جوس۔''

''جواب درست ہوا۔'' دادا ابا مسکرانے لگے۔

''دادا ابا! گنے کو کیسے اُگاتے ہیں، اس کے تو بیج بھی نہیں ہوتے؟'' خضر نے پوچھا۔

''اچھا سوال ہے، بیٹا!'' دادا ابا کہنے لگے، ''گنے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے انہیں کھیلیوں میں ڈالا جاتا ہے اور اوپر مٹی ڈال کر پانی لگا دیتے ہیں، چند ہی مہینوں میں فصل تیار ہو جاتی ہے۔''

بچے گاؤں واپس آئے تو خوشی خوشی دادی اماں کو سارے دن کی رُوداد سنانے لگے۔ وہ اس بات پر بھی بہت خوش تھے کہ انھیں اپنے علاقہ بلکہ مُلک کی اہم فصلوں کے بارے میں اتنی ڈھیر ساری نئی معلومات مل گئی تھیں۔

سچ تو یہ تھا کہ اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیاں گاؤں میں گزارنا ان کے لیے بہت سُودمند ثابت ہوا تھا، اور وہ شہر واپس جا کر اپنے ہم جماعتوں اور اساتذہ کو مزے لے لے کر بہت سی نئی باتیں بتائیں گے۔

مشق

سوال:

1. چاول کی فصل کو کن مراحل میں کاشت کیا جاتا ہے؟
2. چاول (دھان) کی پنیری منتقل کرتے ہوئے کسان کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
3. آپ کی رائے میں پاکستان کی سب سے اہم فصل کون سی ہے اور کیوں؟
4. ہمارے ملک میں کپاس کی پیداوار کیوں کم ہوتی چلی جا رہی ہے؟
5. گنے کی فصل کی کیا اہمیت ہے؟ اسے کس طرح کاشت کیا جاتا ہے؟

سکول کا کام

اکثر سکول اپنے بچوں کو سال میں ایک آدھ بار کسی تاریخی یا تفریحی مقام پر لے کر جاتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو آپ اپنے بچوں کو کسی قریبی گاؤں یا فارم ہاؤس پر لے کر جائیں اور انھیں وہاں کے درختوں، فصلوں اور مویشیوں سے متعارف کروائیں۔

گھر کا کام

بچوں کو ترغیب دیجیے کہ جن کے رشتہ دار یا کوئی اور قریبی عزیز کسی گاؤں میں بستے ہوں، انھیں دیہاتی زندگی کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی چھٹیوں میں کچھ دن گزارنے، ان کے پاس ضرور جانا چاہیے۔ دیگر فوائد کے ساتھ ساتھ، وہ وہاں پر کاشت ہونے والی فصلوں کا بھی مشاہدہ کر سکیں گے۔ ان کی حوصلہ افزائی کیجیے کہ انھیں چھٹیوں کے دوران اپنے مشاہدات پر مبنی ڈائری یا روزنامچہ لکھنا چاہیے۔ چھٹیوں کے اختتام پر انھیں چاہیے کہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں 'گاؤں کی سیر' کے موضوع پر ایک تفصیلی مضمون لکھیں اور ہم جماعتوں کے سامنے پیش کریں۔

ذمہ دار شہری

والدین نے خضر اور گُل کو سکھا رکھا تھا کہ یہ دُنیا ہمارا گھر ہے اور اس کا خیال رکھنا ہم سب پر فرض ہے۔ اس پر لگے ہوئے درخت بھی ہمارے اپنے ہیں اور ہم سب کو مل کر ان کا خیال بھی رکھنا ہے۔ اُنھوں نے اپنے بچّوں کو یہ بھی سکھا رکھا تھا کہ اگر سڑکوں کے کناروں، فٹ پاتھوں، پارکوں اور دیگر عوامی مقامات پر کسی درخت کو یا اس کی بڑی شاخوں کو کاٹا جا رہا ہو تو شہریوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ آگے بڑھ کر کاٹنے والوں سے پوچھیں کہ وہ ایسا کیوں اور کس کی اجازت سے کر رہے ہیں۔ عمر صاحب نے بچّوں کو بتایا تھا کہ چھوٹی موٹی کانٹ چھانٹ کو چھوڑ کر بڑی کٹائی کے لیے متعلقہ محکموں سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا ہے، اور اجازت نامہ نہ ہونے کی صورت میں کاٹنے والے کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔ عمر صاحب کا تو معمول تھا کہ کسی جگہ درخت کٹتا دیکھتے تو گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے پوچھنے جا پہنچتے اور اگر کسی کے پاس ایسا اجازت نامہ نہ ہوتا تو قریبی پولیس سٹیشن یا متعلقہ محکمہ کو فون پر اطلاع دیتے۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے اپنے موبائل میں سارے ضروری فون نمبر محفوظ کر رکھے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے تھے۔ بچے بھی ہر وقت چوکنے رہا کرتے تھے اور سفر کرنے کے دوران کبھی بھی کوئی ایسا نظارہ دیکھتے تو فوراً اپنے والد کو آگاہ کرتے تھے۔

''ابو، یہ شخص اس وقت کیوں شاخیں کاٹ رہا ہے؟'' خضر نے ایک روز علی الصبح عمر صاحب کے ساتھ سیر کے لیے قریبی پارک جاتے ہوئے پوچھا۔
اس قدر صبح اس طرح کا کام کرتے دیکھ کر عمر صاحب کو بھی شک گزرا۔ اُنھوں نے فوراً گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور کٹائی کرنے والے نوجوان سے پوچھنے نکل پڑے۔ وہ کہنے لگا کہ وہ باقاعدہ اجازت لے کر کٹائی کر رہا ہے۔ اُس سے اجازت نامہ دکھانے کو کہا تو وہ گڑبڑا گیا کہ اجازت نامہ تو اس کے پاس اس وقت نہیں۔ اس نے البتہ متعلقہ محکمہ کے سُپر وائزر سے فون پر بات کروانے کی پیش کش کی۔ عمر صاحب نے اس سے سُپر وائزر کا نام اور نمبر پوچھ کر نوٹ کر

لیا۔ اسی طرح اس کی پک اَپ کی، جس پر وہ شاخیں لاد رہا تھا، سامنے اور عقب سے تصویریں بھی بنالیں۔ اس شخص کا نام اور نمبر بھی نوٹ کرلیا۔ اس شام عمر صاحب گھر آئے تو بچوں کو بتایا کہ انھوں نے آفس کے کام میں سے کچھ وقت نکال کر متعلقہ محکمہ کے سربراہ کے نام درخواست تیار کی تھی اور تمام معلومات اور تصاویر کے ساتھ اس کو ای میل کے ذریعے ارسال بھی کردیا تھا، اور خوشی کی بات یہ تھی کہ ان کی جوابی فون کال بھی آئی تھی اور سُپر وائزر سمیت تمام ذمہ داران کے خلاف کارروائی کرنے کی یقین دہانی بھی کروائی گئی تھی۔ محکمہ کے سربراہ نے عمر صاحب کی کاوشوں کی بھی تعریف کی تھی اور اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ان کی طرح کے چوکس اور ذمہ دار شہری، حکومت اور اس کے اداروں کا بازو بنتے ہیں اور انہیں مضبوط کرتے ہیں۔

خضر اور گُل کے گھر کے بالکل سامنے سفیدے کا ایک بڑا درخت لگا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا جھکاؤ خطرناک حد تک ان کے گھر کی طرف ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی شاخیں اور پتے اکثر ان کے گھر میں گرتے رہتے تھے اور وہ لوگ درختوں کی محبت میں یہ سب کچھ برداشت کرلیتے تھے۔ ڈاکٹر شہناز البتہ کہتی تھیں کہ گھر کے لان میں بہت گند پڑتا ہے لیکن عمر صاحب ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے کہ پتے گند تھوڑی ڈالتے ہیں بلکہ اس جگہ کو اور بھی حسین بنا دیتے ہیں۔ پھر ایک روز آندھی کے بعد ایک بڑی شاخ ان کے گیراج میں آگری۔ قسمت اچھی تھی کہ گاڑی بچ گئی لیکن سب پریشان ہوگئے کہ مستقبل میں کوئی بڑا حادثہ بھی رونما ہوسکتا تھا۔ اس درخت کی کچھ شاخوں کو کاٹنا اب ناگزیر تھا۔ اگرچہ کسی رات کو یہ کام چپ چاپ بھی کیا جاسکتا تھا لیکن ان سب کا ضمیر یہ گوارا نہ کرتا تھا، سو متعلقہ محکمہ کے نام ایک درخواست تیار کی گئی اور اس ساری صورتحال کو بیان کیا گیا جس کے تناظر میں درخت کاٹنے کی بات کی جارہی تھی۔ ان کی درخواست کو جزوی قبولیت ملی۔ محکمہ نے ان کے گھر کی طرف جھکی بڑی شاخوں کو کاٹنے کا فیصلہ تو کیا البتہ باقی درخت کو نقصان نہ پہنچانے کا کہا۔ پھر محکمہ کے لوگ ایک روز ایک چھوٹے ٹرک پر اپنا سامان لے کر آئے اور کٹائی میں مصروف ہوگئے۔ اُسی دوران ایک کار ان کے گھر کے سامنے آکر رکی اور اس میں سے ایک صاحب نکل کر عمر صاحب سے کچھ پوچھنے لگے۔ عمر صاحب اُن کی بات سُن کر واپس آئے تو بچّوں کو متجسس پایا۔

''انکل کیا کہہ رہے تھے؟'' گل پوچھنے لگی۔

''بھئی وہ کسی دوسرے خضر اور گُل کے ابوّ تھے، پوچھ رہے تھے آپ کس کی اجازت سے یہ درخت کاٹ رہے ہیں، تو مَیں نے اُنھیں اجازت نامہ دکھا کر مطمئن کردیا۔'' عمر صاحب نے خوش دِلی سے بتایا۔

وہ سب مسکرانے لگے، انھیں اچھا لگا تھا کہ آج کسی اور نے رک کر انہیں بھی جواب دہ کیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہو درختوں کے حوالہ سے سب لوگ ہی اتنے ذمہ دار اور حساس ہوجائیں!

ایک روز عمر صاحب نے گھر والوں کو بتایا کہ وہ لوگ ایک برگد کے درخت کو بچانے کے لیے، جو ایک سڑک کی توسیع کی زد میں آرہا تھا، ایک احتجاجی مُظاہرے میں شریک ہونے جائیں گے۔ وہ درخت اور نہیں تو ڈیڑھ دوسو سال پرانا تو تھا ہی۔ مُظاہرے میں اس روز بہت کم لوگ شریک تھے، تقریریں البتہ کافی جوشیلی کی گئیں۔ میڈیا کے کچھ لوگ ان کی تصویریں بنا کر اور انٹرویو لے کر چلے گئے۔ یہ سلسلہ کئی روز چلتا رہا۔ روز شام کو سارے گھر والے موقع پر پہنچ جاتے اور مُظاہرہ میں شریک ہوجاتے تھے۔ رفتہ رفتہ مُظاہرین کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی تھی؛ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سب اس میں شریک ہونے لگے تھے۔ یاد رہے کہ وہ لوگ سڑکوں کی توسیع کے مخالف نہ تھے، اور اس بات کا پورا ادراک رکھتے تھے کہ بعض اوقات بڑھتی ہوئی آبادی کے تناظر میں سڑکوں کی توسیع ناگزیر ہوجاتی تھی۔ ان کا مؤقف تو بس یہ تھا کہ ایسی صورت میں سڑک کی توسیع اسی قدر کی جانی چاہیے جس قدر ضروری ہو۔ ایسا کرتے ہوئے یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ سڑک کے ڈیزائن، چوڑائی یا رُخ کو بدل کر کس طرح پہلے سے موجود درختوں کو کم سے کم نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ شہری اداروں کو تو اب وہ مشینیں بھی خریدنے کا اہتمام کرنا چاہیے جو پورے کے پورے درخت کو جڑوں سمیت اکھاڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بحفاظت

منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ ایک درخت کو بنتے بنتے تو کئی سال بلکہ دہائیاں لگ جاتی ہیں لیکن لمحوں میں اکھاڑ کر یا کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس حوالہ سے مجید امجد کی نظم 'توسیعِ شہر' کے یہ اشعار بڑے برمحل ہیں:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سُہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بِک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

آنے والے دنوں میں میڈیا بھی اس معاملہ اور اس سے جُڑے احتجاج کی خاصی تشہیر کرنے لگا تھا۔ پھر ایک شام ایک سرکاری اہلکار اس مظاہرہ میں آیا اور اعلان کیا کہ سڑک کی توسیع کے منصوبہ پر نظرِ ثانی کر لی گئی ہے اور عوامی مطالبے کے پیشِ نظر، اب درخت کو بچا کر سڑک کو گزارا جائے گا۔ مُظاہرین نے تالیاں بجا کر اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور ایک دوسرے کو مبارک باد بھی دی۔

اتنے برس گزر جانے کے بعد آج بھی وہ درخت اس سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہے جو محض اسے بچانے کی خاطر وہاں سے خم کھا کر اس کے دونوں اطراف سے گزر جاتی ہے۔ وہ درخت اس بات کی یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ مُہذّب معاشروں میں شہری اگر اچھے کاموں کے لیے مِل کر آواز اٹھائیں تو کچھ بھی حاصل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

مشق

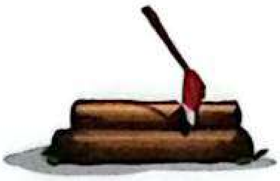

سوال:

1. اگر ایک شہری سڑک کے کنارے کسی درخت کو کٹتا دیکھے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟
2. اگر آپ کے علاقہ میں اہلِ علاقہ کی ضرورت کے پیشِ نظر، سڑک کی توسیع کی جارہی ہو اور اس توسیع کے نتیجہ میں ایک برگد کے پرانے درخت کے کٹنے کا احتمال ہو تو آپ کی رائے میں کیا کِیا جانا چاہیے؟ اگر وہ درخت سفیدے کا ہوتا تو آپ کی رائے کس طرح سے مختلف ہوتی؟
3. گھر کے لان یا اطراف میں درختوں سے جھڑنے والے پتوں کا تفصیلاً کوئی ایک مصرف بتائیے؟
4. اگر آپ کے گھر کے لان یا اطراف میں کوئی درخت کسی بیماری کا شکار ہو کر مرجھانے لگ جائے تو اس صورت میں آپ کی کیا حکمتِ عملی ہو سکتی ہے؟
5. درختوں کی کٹائی کے حوالہ سے شہریوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے اور اپنا کردار بھرپور انداز میں نبھانے پر آمادہ کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟

عملی کام

سکول کا کام

بچوں میں موسمیاتی تبدیلی کے تناظر میں درختوں کی کٹائی کے حوالہ سے شعور بیدار کرنے اور اُن کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے مکالمے، مباحثے اور مضمون نویسی کے مقابلے منعقد کروائیں۔ اگر ہو سکے تو ایسے مقابلے سکول کی سطح پر منعقد کیے جانے چاہییں یا کم از کم ان مقابلہ جات میں دیگر جماعتوں کے طلبہ کی بطور سامعین شرکت کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

گھر کا کام

اپنے گھر والوں کے ساتھ مکالمہ کیجیے کہ اگر کبھی آپ لوگ درختوں کی غیر قانونی کٹائی دیکھیں تو اس حوالہ سے آپ لوگوں کی کیا ذمہ داری بنتی ہے اور ایسی صورتحال میں کیا حکمت عملی اپنانی چاہیے۔ گھر کے سربراہ یا بڑوں کو اس بات پر بھی آمادہ کیا جانا چاہیے کہ ایسی صورتحال سے نمٹنے کے لیے ان کے پاس متعلقہ محکمہ اور ضلعی انتظامیہ کے ساتھ ساتھ پولیس ہیلپ لائن یا قریبی تھانے کا نمبر ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کارروائی کی تکمیل کے بعد اپنے ٹیچر کو ایک تحریری رپورٹ جمع کروائیں۔

اشاریہ

لفظ	صفحہ نمبر
آ	
آبِ حیات	13,17
آلودگی	13,14,23,25,43,4
آلودہ پانی	14,25,48
آکسیجن	9,28,57,60
ا	
امریکہ	30
ادویات	30
اسلام آباد	83,84
اکیرامیاواکی	62
الٹا آشوک	37
امریکن گھاس	34,35
انڈس ڈیلٹا	25,66
انڈس ڈولفن	24
انگلش آئیوی	59
اوزون	20,22
ایلوویرا	60
اینٹوں کے بھٹے	13,14
ایندھن	10,65,66
اریکا پام	37,38
اڑیال	65

لفظ	صفحہ نمبر
ب	
بروکلی	51
برگد کا درخت	88
بلائنڈ ڈولفن	25
بلبل	44
بلی	82,86
بوتل پام	37,38
بیمبو پام	58,59
بند گوبھی	53
بوگن بیل	38,40
بھنڈی	51,54
بھیڑیے	65
بیری	90,93
بیل گاڑی	81,82
بحیرہ عرب	24,25
باغبانی	8,71
بینگن	51,54
بھارت	30
بلوچستان	28
بہار	28
بند	29,30

لفظ	صفحہ نمبر
پ	
پاکستان	14,18,24,25,28,31, 32,38,42,47,65, 66,84,85,88,98
پانی کے ذخائر	30
پیلو	88
پالک	51,53,55
پٹونیا	46
پروین شاکر	10
پونی ٹیل پام	38,59
پیپل	89,90,92
پینزی	46
ت	
تربوز	54
تربیلا ڈیم	24
تیزابی بارش	15,17
تر	51,54
ترقی پذیر ممالک	30,31
ٹ	
ٹیوب ویل	96
ٹینڈا	51,54
ٹماٹر	51,53

لفظ	صفحہ نمبر
ٹی وی لاؤنج	13
ج	
جامن	71,90,91,94
جگنو	43,44,45,47
جھمکا بیل	38
جامشورو	26
جدید ٹیکنالوجی	30
جنوبی اضلاع	28
چ	
چاول	95,99
چنبیلی	42,43
چوہا	81,85,86
چین	24,30
چڑیوں	10,33,80
ح	
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	80,81,86
حیاتی نظام	63,65
حشرات الارض	13
خ	
خاکی یا سرمئی	51,52,74
خام مال	15
خربوزہ	54
خشک سالی	28
خیبر پختونخوا	28

لفظ	صفحہ نمبر
خضر	8,13,14,17,18,19 23,24,26,28,33,39 41,42,43,45,48,49 50,51,57,58,62,63 68,75,76,77,78,89 90,96,97,98,100,101
د	
دیسی گھاس	34,35
درجہ حرارت	8,17,18,19,22,76
درون خانہ پودے	57,58,60,61
دریائی مٹی	34,70
دریائے بیاس	24
دریائے راوی	24
دریائے جہلم	24
دریائے ستلج	24
دریائے سندھ	23,24,25,26,27
دھان	95,96,99
دھند	14
دھواں	13,14
دھنیا	46,48
ڈ	
ڈریسینا	59
ڈیرہ غازی خان	24
ڈینگی مچھر	19,22

لفظ	صفحہ نمبر
ڈیورنٹا	39,40
ر	
رحمت اللعالمین	86
رات کی رانی	43,44,47
ربر پلانٹ	59,60
ریچھ	65
روس	30
ری سائیکلنگ	14,15,25
ز	
زمین کا کٹاؤ	9,12,66
زمینی آلودگی	13,15,76
زہریلی گیسیں	13
زیارت	65
زینیا	43
س	
سوئی گیس	65
سکولینٹ	60,61
سلاد	51,53
سبز مواد	51,52
سبز چائے	42
سپائیڈر پلانٹ	59,60
سٹار فلاور	60
سیوریج	13,14,15
سونامی	18

لفظ	صفحہ نمبر
سرجیکب پیٹر	68,69,70,71,72,73
سری لنکا	84
سلفر ڈائی آکسائیڈ	17
سلور فین پام	38
سفیدہ	90,91,101,103
سموگ	13,14,16
سنک پلانٹ	60
سیلاب	28,29,30,32
سندھ	28
سیلابی پانی	28
سیلاب زدگان	29
سودا سلف	29,32
ش	
شمسی توانائی	70
شہد کی مکھی	45
شہاب نامہ	88
شہری شجر کاری	76
شہری منصوبہ بندی	30
شمالی علاقہ جات	28
شور کی آلودگی	77
شملہ مرچ	51
شیشم	89,93
شدید گرمی	28
ص	
صنوبر کے جنگلات	65,67

لفظ	صفحہ نمبر
ع	
عبدالحمید دائیں	68
عدالت عالیہ	84
علامہ اقبال	44
عمر	8,9,10,11,13,14,15
	17,23,24,25,26,28
	29,30,31,33,34,36
	38,39,41,42,43,44
	45,46,51,62,63,75
	76,77,78,80,81,82
	84,88,96,97,98
	100,101
ف	
فائیکس	39,40
فائن ڈھاکہ	34,35
فرن	59
فوکس ٹیل پام	37,38
فضائی آلودگی	66,76
فیکٹریوں	13,14,17
فیلوڈینڈران	59,60
فالتو پانی	30
فلاحی مقصد	32
ق	
قائداعظم محمد علی جناح	65
قدرتی آفات	18

لفظ	صفحہ نمبر
ک	
کلوروفلوروکاربن	20
کیمیکل ذرات	13
کیمیائی کھادیں	13,48
کاربن ڈائی آکسائیڈ	9,18,33,57,60,76
کاون	84,87
کپاس	25,97
کچن گارڈننگ	48,49,56,70,72,73
کچنار پارک	75
کدو	51,54
کریلا	51,54
کمبوڈیا	84
کمپوسٹ	51,52
کوئین پام	38
کورین گھاس	34,35
کھیتی حسماں سیتی	49,56
کھیرا	51,54
کین پام	38
کیڑے مار ادویات	13,23,43,48,49
	50,56,97
کیکٹس	60
کیکر	88,90,92
گ	
گولڈن پام	58,59
گولڈن شاور بیل	38

لفظ	صفحہ نمبر	لفظ	صفحہ نمبر	لفظ	صفحہ نمبر
گاجر	51,53	**ل**		مولی	51,53,55
گاڑیوں	13,17	لہسن	53	مسکن	9,10
گدھا گاڑی	81,82	لیڈی پام	58,59	موہنجوداڑو	51,53,55
گرین ہاؤس	15,17,18,22	لیلر	34,70	منی پلانٹ	58
گلاب	41,42,47	**م**		میاں محمد بخش	88
گل دوپہری	45,46	میری گولڈ	43,45	میاواکی	62,63,64,67,70,72
گل نرگس	45,46	مینگروو جنگلات	25,66	میتھی	51,55
گل داؤدی	45,46	مارخور	65	**ن**	
گلوبل وارمنگ	8,12,21,22	مارگلہ	78	نامیاتی کاشت کاری	25,51
گلی ڈنڈا	88	ماحولیاتی نظام	63,65	نائٹروجن آکسائیڈ	17
گلیشیر	23,25,28	ماہر غذائیت	8	**و**	
گنا	25,97,98,99	موسمیاتی تبدیلی	8,9,11,13,20,22,23	وفاقی محکمہ	8
گندم	25,96		24,25,26,27,28,29	ونگا	43,44
گوتم بدھ	89		30,31,32,43,68,71	**ہ**	
گھیا توری	51,54		96,103	ہڑپہ	23
گل	8,9,11,13,15,17	مٹر	51,53	ہندوستان	24
	18,19,20,22,23,25	مجید امجد	102		
	26,28,29,31,39	محکمہ زراعت	48		
	41,42,43,46,48	مرغی	51,80,81,87		
	49,50,57,58,63	مرلہ	48,50		
	75,76,77,81,84	مضر گیسیں	9,13,30,31		
	89,90,100,101	موسمیاتی انصاف	31,32		

کچھ مصنّف کے بارے میں

احتشام انور اس کتاب کے مصنف ہیں۔ آپ کا تعلق پاکستان کی سول سروس سے ہے۔ آبائی علاقہ سیالکوٹ کی ایک تحصیل ڈسکہ، بلکہ اس کا بھی ایک گاؤں بھیلو مہار ہے۔ تعلیمی پس منظر کے حوالہ سے ایک میڈیکل گریجویٹ ہیں لیکن ڈاکٹری کے بجائے مقابلہ کا امتحان پاس کر کے سول سروس کی طرف آنکلے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ازل سے طالب علم رہے ہیں اور حصول علم کا یہ سلسلہ دورانِ ملازمت بھی جاری رہا۔ قانون کی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے سو پاکستان سے قانون کی ڈگری لی، برطانیہ سے بیرسٹری پڑھی اور امریکہ سے انسانی حقوق میں فیلو شپ کی۔ تاریخ پر نظر رکھتے ہیں اور اس میں بھی ماسٹرز کر رکھا ہے۔

سول سروس کا سفر اسلام آباد میں بطور اسسٹنٹ کمشنر تعیناتی سے شروع ہوا، اور بعد ازاں پنجاب کے تین اضلاع بہاولپور، مظفر گڑھ اور ساہیوال میں ڈپٹی کمشنر تعینات رہے۔ ۲۰۲۰ میں جنوبی پنجاب سیکرٹریٹ کا قیام عمل میں آیا تو یہاں کے سب سے پہلے سیکرٹری ایجوکیشن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 'موسمیاتی تبدیلی' کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے سو آنے والے دنوں میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی نسل کو تیار کرنے کی ٹھانی اور حکومت پنجاب کی سرپرستی میں جنوبی پنجاب کے سرکاری سکولوں میں اسے بطور مضمون متعارف کروایا۔ سبز کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

احتشام انور کا ہمیشہ سے ہی لکھنے پڑھنے سے تعلق رہا ہے۔ انگریزی کے تمام بڑے اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اردو میں لکھنے کی بھی سعی کرتے رہتے ہیں اور 'ہم سب' پر ان کے بہت سے مضامین محفوظ ہیں۔

یہ تو ہو گئے ان کے مختصراً حالاتِ زندگی؛ سلسلہ روز شب جاری و ساری ہے اور بقول غالب:

رَو میں ہے رَخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نَے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رِکاب میں

www.facebook.com/anwarehtasham
anwarehtasham@gmail.com
www.humsub.com.pk/author/ehtasham-anwar/